# A CRITICAL APPRAISAL OF THE LINGUAL HISTORY OF URDU LANGUAGE

ABSTRACT

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

**Doctor of Philosophy**

IN

URDU

*Hasnain Sialvi*

BY


MD. BAKAR. A. SIDDIQUI

Under the Supervision of

PROF. ABUL KALAM QASMI

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)


2008

# اُردو زبان کی لسانی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

(مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی)

## تلخیص



مقالہ نگار
محمد بکر عالم صدیقی

نگراں
پروفیسر ابوالکلام قاسمی



شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۰۰۸ء

کسی موضوع کا احاطہ اس کے پس منظر اور پیش منظر پر نگاہ رکھے بغیر کسی طور ممکن نہیں۔ نیز اس سے وابستہ تمام مباحث اور علوم جن کا تعلق موضوع سے براہِ راست یا بالواسطہ ہوتا ہے ان پر گفتگو کیے بغیر یا اس سے متعلق تمام تناظر پر نگاہ رکھے بغیر اس کا تصور واضح کرنا بہت مشکل مرحلہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح ''اردو زبان کی لسانی تاریخوں'' پر جب بھی گفتگو کی جائے گی تو اس کی کئی جہتیں ہمارے سامنے آئیں گی اور ان پر تفصیلی گفتگو کیے بغیر موضوع کا تعین اور اس سے انصاف ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں پہلی قابل توجہ بات یہ ہے کہ اردو زبان کی با قاعدہ لسانی تاریخ رقم کرنے کا سلسلہ اردو میں اچانک شروع نہیں ہوا بلکہ اس سے متعلق اوّل اوّل بعض ایسی تحریریں سامنے آنا شروع ہوئیں جنہیں اس ضمن میں ابتدائی نقوش کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے اردو زبان کی ساخت متعین ہوتی گئی اور یہ زبان ادبی اسالیب کے اظہار کے قابل ہوسکی تو علمائے اردو نے علمی اور ادبی حلقوں میں اسے متعارف کرانے اور اس کی اصل اور آغاز کی تاریخ کو متعین کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کام میں مستشرقین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کیوں کہ یہ بات ہمیں ملحوظ رکھنی چاہیے کے ہندوستان کی فضا میں ہندوستانی (اردو کا ابتدائی نام) ان کے لیے نئی زبان تھی اور ہر طرح کے علم سے دلچسپی ان کے مزاج میں داخل تھی۔ اٹھارہویں صدی کے آخری دہوں اور انیسویں صدی کی ابتدا سے اردو زبان کی حیثیت ایک ادبی زبان کے طور پر متشکل ہونے لگی اور اس کے ارتقا کے مزید اقدام اٹھائے گئے۔ یہ کوششیں انفرادی اور اجتماعی دونوں نوعیتوں کی تھیں نتیجتاً جیسے جیسے اردو زبان ترقی کرتی گئی ویسے ویسے اس کی اصل اور ابتدا سے متعلق سوالات قائم ہوتے گئے۔ اردو شعرو ادب کے مطالعہ سے ہمیں اندازہ ہوگا کہ قدیم زمانے میں اردو نام کی کوئی زبان نہیں تھی بلکہ تاریخ میں یہ زبان جو آج اردو کہلاتی ہے اپنے مختلف ناموں سے پہچانی جاتی تھی۔ شعرائے اردو نے اپنے تذکرے اور اشعار میں کبھی اسے ہندی کہا ہے تو کبھی ہندوی، کبھی ریختہ سے موسوم کیا ہے تو کبھی دہلوی سے لیکن اردو،

اسم زبان کے اعتبار سے ان سب میں نوعمر ہے۔ میر اور غالب کے زمانے تک ''ریختہ'' اور ''ہندی'' کے الفاظ ہماری موجودہ زبان کے نام کی حیثیت سے یکساں مقبول تھے۔ یہ حالت تقریباً اٹھارہویں صدی تک برقرار رہی۔ انیسویں صدی میں زبان کے نام پر ''ہندی'' کو ''ریختہ'' پر ترجیح دیا جانے لگا۔ میر کا یہ شعر اٹھارہویں صدی کے وسط میں کہا گیا تھا:

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر　　یہ ہماری زبان ہے پیارے

دوسری جانب غالب کا شعر جواب زبان زد خلائق ہے انیسویں صدی میں کہا گیا تھا:

ریختے کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

خود مصحفی کے یہاں مختلف وقت میں ہماری زبان کے لیے الگ الگ نام استعمال میں آتے ہیں۔ ان کے کلیات میں اس نوعیت کے متعدد اشعار دیکھے جاسکتے ہیں جیسے:

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ　　اب ہے اشعار ہندوی کا رواج

البتہ مصحفی کو ہے ریختے میں دعویٰ　　یعنی کے ہے زباں داں اردو کی وہ زباں کا

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی　　کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

ان اشعار کے تجزیہ سے اردو زبان کی تاریخ کئی اعتبار سے منعکس ہوتی نظر آئے گی۔ اس تعلق سے مذکورہ بالا شعر میں استعمال ہوئے الفاظ مثلاً ہندوی، ریختہ، اردو کی زبان اور پھر اردو کی نشاندہی سے اردو زبان کے نام کے کئی مرحلے واضح ہو جاتے ہیں۔ ان باتوں سے قطع نظر فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی ''باغ و بہار'' نے لفظ اردو کو زبان کی حیثیت سے بالکل واضح کر دیا۔ مزید اس کتاب نے اردو زبان کی تاریخ نویسی کی بسم اللہ کر دی۔ باغ و بہار کے بعد یکے بعد دیگرے تقریباً پوری انیسویں صدی میں کسی بھی موضوع پر کوئی بھی کتاب لکھی جاتی اس میں ضمناً اردو زبان کے حال و احوال کا ذکر ضرور کیا جاتا۔ ہمارے پاس ایسی متعدد تحریریں دستیاب ہیں جن کا شماران حوالوں سے ہوتا ہے لیکن ان میں ہم چند کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان تحریروں کو عام طور سے اردو زبان کی تاریخ نویسی کے لیے محرک اور ابتدائی نقوش کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے اور اردو کی جتنی بھی باقاعدہ لسانی تاریخیں موجود ہیں ان میں ان تحریروں کا ذکر بہرحال کیا جاتا ہے۔

اردو زبان کی لسانی تاریخ کے لیے بیسویں صدی میں باقاعدہ ایک لسانی رجحان اختیار کیا گیا اور پورے سو سال بھی نہیں ہونے پائی کے اس موضوع پر بہت اچھی تحریریں اور تصانیف منظر عام پر آئیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر اس تحقیقی مقالہ کا موضوع ''اردو زبان کی لسانی تاریخوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ'' منتخب کیا گیا۔ کچھ دنوں کی ذہنی کش مکش کے بعد اس موضوع کا تجزیہ کرنے کے بعد نتیجے کے طور پر چند باتیں سامنے آئیں جنہیں مختلف خانوں میں رکھ کر اس طرح دیکھا جا سکتا ہے۔

(۱) اردو : ایک مخصوص زبان ہے جس کا آغاز وارتقا اس گفتگو کا موضوع ہے۔

(۲) زبان : انسان کے خیالات کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ ایک اصطلاح اور مطالعہ کے اعتبار سے ایک پیچیدہ موضوع ہے جو اب علم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

(۳) لسانیات : ایک جدید شعبۂ علم ہے جس کا دائرۂ کار زبان کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے ہے۔ یعنی زبانوں کا تجزیہ، ان کی تاریخ، ان کی مشترک نقاط وارتباط، ان کی معنوی ساخت اور ان کی ظاہری تقسیم و گروہ بندی پر غور وخوض کرنا لسانیات کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ چونکہ زبان لفظوں سے بنتی ہے اس لئے ماہرین لسانیات کا تعلق بالعموم لفظوں ہی سے ہوتا ہے۔ وہ ان پر اس لیے غور وخوض نہیں کرتے کہ ان کے معانی و مطالب دریافت کریں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تاریخ معلوم کریں۔

(۴) تاریخ : علم زبان کی روشنی میں لکھی گئی تاریخیں جنہیں اردو کی لسانی تاریخوں کا نام دیا جاتا ہے۔

(۵) تحقیق : اردو زبان کی موجودہ تمام لسانی تاریخوں کا بالاستعیاب مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ لسانیات کی رو سے تسلیم شدہ حقائق کی کسوٹی پر کون سی تاریخ معتبر قرار دی جا سکتی ہے اور کون نامعتبر۔

(۶) تنقید : اس سلسلے میں اختیار کیا گیا متذکرہ بالا طریقے کو تنقید کا نام دیا جا سکتا ہے۔

کسی زبان کی اصل اور اس کی تاریخ پر گفتگو کرتے وقت ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔ یہ اس موضوع کے اجزا کہے جا سکتے ہیں جو ایک دوسرے میں پیوست ہیں اور ان سب کا تصور جب تک واضح نہ ہو تب تک کسی نتیجہ پر پہنچنا شاید مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو۔ جیسا کے ابتدائی سطور میں اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا کہ ایسے تمام مباحث اور علوم جن کا تعلق موضوع سے براہِ راست یا بالواسطہ ہوسکتا ہے ان پر گفتگو کیے بغیر اس مخصوص موضوع کا تصور واضح کرنا مشکل کام ہے۔ اس معروضہ کو ملحوظ

رکھتے ہوئے ہم نے دو تمہیدی ابواب قائم کیے ہیں ۔ پہلے باب میں زبان کی تعریف، اس کی ماہیت اور اہمیت کے علاوہ علم زبان پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ زبان سے متعلق عام تصور یہ ہے کہ یہ انسان کے خیالات کی ترسیل کا ذریعہ ہے۔ لیکن جب ہم اس اصطلاح پر سنجیدگی سے غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک با قاعدہ علم ہے اور اس کی جامع اور مانع تعریف دوسرے علوم کے بنیادی تصورات کی طرح کسی قدر مشکل ہے۔ مجموعی طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ کسی نہ کسی ترسیلی وسیلہ کا اختیار کرنا انسان کا خاصہ ہے۔ اس لئے یہ علماء کے نزدیک ایک وسیع اصطلاح اور مضمون کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ بحیثیت اصطلاح زبان ایک پیچیدہ موضوع یا مسئلہ ہے۔ اس کا مطالعہ علم زبان کے تحت کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں مشرق ومغرب کے ماہرین کی آرا پیش نظر رکھ کر سیر حاصل بحث کی گئی ہے تا کہ ان تمام بنیادی باتوں کا احاطہ کیا جا سکے جن سے واقف ہوئے بغیر زبان کی تاریخ سمجھنا مشکل مرحلہ ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی زبان کی ماہیت اور اس کی اہمیت پر بھی خاطر خواہ گفتگو کی گئی ہے۔ یعنی زبان صرف اظہار کا وسیلہ نہیں ورنہ ایسے وسائل اور بھی کئی طرح سے ممکن ہیں مثلاً تحریری اور حرکات جسمانی کی حیثیت سے۔ نیز اظہار کا وسیلہ جانوروں کے اندر بھی موجود ہوتا ہے ۔ پھر وہ کون سی خصوصیات ہیں جو انسان کی زبان کو دوسروں سے ممیز کرتی ہیں ۔ یعنی ہم جس زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ صرف اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کو ایک شکل متعین کرتی ہے۔ زبان کسی بھی علم کے حصول کا ذریعہ ہے اور ہماری فکر اور علوم کو ایک نسل سے دوری نسلوں تک منتقل کرتی ہے۔ یہ سماج میں پیدا ہوتی ہے اور اسی میں ارتقا کی منزلیں طئے کرتی ہے گویا یہ ایک سماجی عمل ہے۔ بلکہ اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں ایک کے بغیر دوسرے کا تصوّر ممکن نہیں۔

پیش نظر مقالہ کا دوسرا باب ''لسانی گروہ بندی اور ہند آریائی کا ارتقا'' کے عنوان سے آریوں کی تاریخ اور ہندوستان میں ان کی زبان کے ارتقا سے متعلق ایک اجمالی خاکہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے تحت پوری دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کے خاندان کا ذکر بالعموم اور ہند یوروپی کی بالخصوص کر کے اس کی مفصل تاریخ پیش کی گئی ہے۔ اس خاندان کو ماہرین نے ہند جرمانی کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ ہند یوروپی دراصل مختلف قوم ونسل کے لوگوں پر مشتمل ایک بڑی آبادی کا گروہ تھا جو آج سے تقریباً ٦٠٠٠ ہزار سال قبل مشترکہ طور

پر ایک زبان بولتا تھا۔ مورخین نے اس ابتدائی جتھے کو وروس (wiros) کے نام سے یاد کیا ہے۔ان لوگوں کا ابتدائی مسکن یوریشیا کا میدانی علاقہ تھا۔بعد میں آہستہ آہستہ ان کے چھوٹے چھوٹے گروہ مختلف سمتوں میں کوچ کر گئے۔ان میں سے ایک شاخ مغرب کی جانب بڑھ گئی جسے یوروپی جماعت کہہ سکتے ہیں۔اور دوسری ایشیاے کوچک میسو پوٹا میا اور ایران ہوتے ہوئے تقریباً ۲۰۰۰ سال قبل مسیح ہندوستان میں داخل ہوئی۔''ہند یوروپی'' کی یہ شاخ ''ہند آریائی'' کہلائی۔اس قوم کو آریا کے نام سے موسوم کیا گیا اور ان کی زبان کی تاریخ صرف ہندوستان میں تقریباً ۴۵۰۰ کو محیط ہے۔زبان کے وسیلے سے اسے مختلف عہد یعنی قدیم، وسطی اور جدید میں منقسم کر کے دیکھا جاتا ہے۔جدید ہند آریائی کا نقطۂ آغاز ۱۰۰۰ء تسلیم کیا جاتا ہے۔اسی عہد میں ہندوستان کی جدید زبانیں ارتقا پذیر ہوئیں ان زبانوں میں ایک زبان اردو بھی ہے جس کی تفصیلات ہم اس باب میں لسانی حقائق کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔

متذکرہ دو تمہیدی ابواب میں زبان کی ماہیت اور اہمیت کے ساتھ دنیا کی زبانوں کے خاندان کا تصوّر اور ان کے ارتقا کی داستان اس لیے رقم کر دی گئی ہے کہ بنیادی موضوع کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو سکے۔کسی بھی موضوع سے متعلق جب تک ہمارے سامنے ایک پیمانہ یا کسوٹی نہیں ہوگی تب تک ہم اس کے کھرے کھوٹے کی تمیز میں دھوکہ کھاتے رہیں گے۔پورے سوا سو سال تک میر امن اور گلکرسٹ کے تتبع میں اہل اردو یہ اعلان کرتے رہے کہ اردو ایک ملغوبہ زبان ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد یہاں کے باشندوں کے اشتراک سے بنی۔اس مقالہ کا تیسرا باب ایسی ہی تحریروں پر مشتمل ہے جو ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سے متعلق گذشتہ سطور میں چند باتیں عرض کی جا چکی ہیں کہ میر امن کی ''باغ و بہار'' ۱۸۰۱ء سے لے کر نصیر الدین ہاشمی کی ''دکن میں اردو'' ۱۹۲۳ء اور اس کے بعد سیّد سلیمان ندوی کی ''نقوش سلیمانی'' ۱۹۳۹ء قابل ذکر ہیں۔ ایسا اس لیے ہوا کہ زبانوں کی حقیقت کا درک ایسے علما کو بالکل نہیں تھا۔بیسویں صدی میں جدید لسانیات کے آغاز کے بعد جب کچھ اہل اردو نے مغربی ممالک میں جا کر اس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ اس علم کی روشنی میں مطالعہ کیا تب اردو کی حقیقت واضح ہوئی اور افسانوی بیانات کا افسوں زائل ہوا۔

اردو میں سب سے پہلے لسانی رویوں کو بروئے کار لا کر اردو زبان کی تاریخ لکھنے کا سہرا محمود شیرانی کے سر جاتا ہے۔ جب انہوں نے ''پنجاب میں اردو'' (۱۹۲۸ء) تحریر فرمائی۔ اس کتاب کا تحقیقی طریقۂ کار اور علمی استدلال اتنا پختہ ہے کہ کے اس کے وسیلے سے شیرانی کے اس کتاب کی علمی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی اور ایک مدت تک اس نظریے کی گونج سنائی دیتی رہی۔ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر زور کی تصنیف بھی منظر عام پر آئی تو شیرانی سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ واضح رہے کے ڈاکٹر زورؔ نے لندن اور پیرس میں رہ کر باقاعدہ جدید لسانیات کی تعلیم حاصل کی تھی۔ محمود شیرانی نے لسانیات کی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی لیکن بیسویں صدی کی ابتدا میں لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے تھوڑا وقت گذارا تھا۔ ممکن ہے کہ انہیں لسانیات کا کچھ علم رہا ہو کیوں کے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ سر ولیم جانس کے مقالے ۱۷۸۶ء کے بعد یورپ میں تقابلی لسانیات کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اور موصوف کی کتاب بھی خالصتاً تقابلی بنیادوں پر لکھی گئی ہے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی رہی ہو شیرانی کی کتاب کے بعد یکے بادیگرے ایسی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں لسانی طریقۂ کار کو ملحوظ رکھ کر اردو زبان کی تاریخ لکھی گئی اور اس طرح بیسویں صدی میں اس موضوع سے متعلق ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ ہم نے آسانی کے لیے بیسویں صدی کی کتابوں کی دو ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔ چوتھا باب بیسویں صدی کے نصف اول کا احاطہ کرتا ہے تو پانچوا اس صدی کے نصف آخر کو محیط ہے۔

اردو زبان پر لکھی جانے والی باقاعدہ لسانی تاریخوں سے پیشتر اور درمیان میں ایسی تحریریں بھی ملتی ہیں جن کا لسانیاتی طریقۂ کار سے کوئی سروکار نہیں پھر بھی اس نوعیت کی بعض مشہور تحریریں شامل کر لی گئی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کی ابتدا سے بیسویں صدی کے چار دہوں تک اس موضوع پر خیالات میں یکسانیت ملتی ہے۔ اس لیے یہ ممکن تھا کہ ایک نوع کی تمام تحریروں کو کسی ایک باب میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن تاریخ ہمیشہ یہ تقاضہ کرتی ہے کہ واقعات کے بیان میں تاریخی تسلسل کا خیال رکھا جائے۔ اس لیے ہم نے خالص لسانی تحریروں کے ساتھ بھی غیر لسانیاتی تحریروں کو بھی شامل کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چوتھے باب کی ابتدا نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف ''دکن میں اردو'' ۱۹۲۳ء سے ہوتی ہے اور اس تسلسل میں شمس اللہ قادری کی ''اردوئے قدیم'' ۱۹۲۵ء، ''نقوش سلیمانی'' ۱۹۳۹ء مصنف سیّد سلیمان ندوی، مسعود حسین خاں کی ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' ۱۹۴۸ء اور احتشام حسین کا مقدمہ جو انہوں نے ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ''

۱۹۴۸ء کے لیے تحریر کیا ہے شامل ہیں۔ان تمام کتابوں پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ کہنا نا مناسب نہیں ہوگا کہ سب نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ محمود شیرانی کی ''پنجاب میں اردو'' لسانی رو سے لکھی گئی پہلی تصنیف ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق جسے آج ہم 'اردو' کہتے ہیں وہ سرزمین پنجاب میں پیدا ہوئی اور وہیں سے ہجرت کر کے دہلی پہنچی۔شروع کے دو ابواب بطور تمہید لکھے گئے ہیں لیکن تیسرا، چوتھا اور پانچواں باب کتاب کی اصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس میں پنجاب کا علاقہ اور اس کی انفرادیت، پنجابی اور اردو، قدیم اردو پر پنجابی زبان کے اثرات، پنجاب کی مختلف زبانوں کے علاوہ پنجابی زبان کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے نصف سے زیادہ صفحات میں ہندوستانی زبانوں کے اس عہد کے تقریباً تمام مشاہیر پنجاب اور ملک کے دیگر حصوں کے نامور مصنفین کے کارنامے اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں ان کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

سیّد محی الدین قادری زورؔ پہلے ماہر ہیں جنھوں نے یورپ میں لسانیات کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔لندن اور پیرس میں قیام کے دوران مغربی ماہرین سے استفادہ کیا۔انگلستان سے واپس آکر ''ہندوستانی لسانیات'' کی ۱۹۳۲ء میں اشاعت کی یہ کتاب موصوف کی تحقیقات کا نتیجہ ہے اور اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف جس میں باقاعدہ لسانیات اور اس کے لوازم کو برتا گیا تھا۔ہم نے دیکھا کہ محمود شیرانی نے اپنی مذکورہ تصنیف میں پنجاب کو اردو زبان کا مولد قرار دیا ہے۔محمود شیرانی کے بعد ڈاکٹر زور نے بھی کچھ اسی طرح کا خیال ظاہر کیا ہے اور پنجاب تا الہ آباد کی زبان پر اردو زبان کی بنا رکھی ہے۔

مسعود حسین خاں نے دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں کے حوالے سے اپنا نظریہ پیش کیا ہے اور مغربی ہندی کی کھڑی بولی پر توجہ صرف کی۔پانچ ابواب میں منقسم ان کی کتاب ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' میں آریوں کے وطن اور ہندوستان میں ان کی زبان کے ارتقا سے متعلق تین ادوار، عہد قدیم، عہد وسطیٰ اور عہد جدید کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی اور اپ بھرنش کے بطن سے مختلف بولیوں کے وجود کی مفصّل تاریخ اور اس کی فہرست پیش کی گئی ہے۔اس میں جدید ہند آریائی کی مخصوص بولیوں مثلاً لہندا، سندھی، مراٹھی، آسامی، بنگالی، اڑیا، بہاری، پنجابی، راجستھانی، اور چند پہاری بولیوں کے علاوہ، مشرقی اور مغربی ہندی کا تفصیلی ذکر کرتے

ہیں اور ان تمام بولیوں کے حدود اربع متعیّن کرتے ہیں۔ مغربی ہندی پر ان کی خاص توجہ ہے کیوں کہ وہ اردو کا سراغ اسی زبان میں ڈھونڈھتے ہیں۔

پروفیسر سیّد احتشام حسین نے جان بیمز کی کتاب "An Outline of Indian Philology" کا ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' (۱۹۴۸) کے نام سے اردو میں ترجمہ کرکے ۶۵ صفحے کا ایک طویل اور بسیط مقدمہ شامل کردیا ہے جو حقیقت میں اس کتاب کی اہمیت بڑھا دیتا ہے۔ یہ مقدمہ اردو سے متعلق لسانی حقائق کا نچوڑ ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں اس نوع کی کتابیں کم لکھی گئیں پھر بھی چند اچھی کتابوں سے اس عہد کا دامن خالی نہیں۔ خود مسعود حسین خاں، شوکت سبزواری، مرزا خلیل احمد بیگ اور گیان چند جین وغیرہ نے اس موضوع پر سنجیدگی سے کام کرتے رہے جس کے نتیجے میں اردو زبان کی تاریخ سے متعلق ایک وقیع سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔ اس سو سال کے عرصے میں بیشتر مصنفین نے اردو کے ماخذ اور اس کی تاریخ پر توجہ صرف کی تو بعض اپنی تحریروں میں اردو لسانیات اور اس سے متعلق نظریات کی گتھیاں سلجھانے اور اس کی تفہیم میں سرگرم رہے۔ بحیثیت مجموعی اردو زبان کے آغاز و ابتدا اور اس کی تاریخ پر باقاعدہ اور سائنٹفک انداز میں تحقیق بیسویں صدی میں شروع ہوئی اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔ ہم نے ایسی ہی تحریروں کو پانچویں باب میں جگہ دی ہے اور اس پر آیندہ بھی تحقیق کا باب کھلا ہوا ہے۔

محمد بکر عالم صدیقی
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۰/۰۹/۲۰۰۹
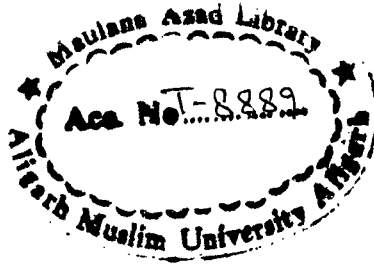
# A CRITICAL APPRAISAL OF THE LINGUAL HISTORY OF URDU LANGUAGE

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

**Doctor of Philosophy**

IN

URDU

BY

MD. BAKAR. A. SIDDIQUI

Under the Supervision of

PROF. ABUL KALAM QASMI

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2008

# اُردو زبان کی لسانی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

(مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی)



مقالہ نگار
محمد بکر عالم صدیقی

نگراں
پروفیسر ابوالکلام قاسمی

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۸ء

**Department of Urdu**
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH – 202002 (INDIA)

Tel.: (0571) 2700920, 921
Extn. 1631

Dated: 20/ 9/.2008

# *Certificate*

This is to certify that **Mr. Md. Bakar Alam Siddiqui** has done his research work entitled ***"Urdu Zaban ki lesani tarikhon ka tahqiqi-o-tanqidi jaizah"***, under the supervision of **Prof. Abul Kalam Qasmi.** This is his original work and has not been submitted for any other degree of this or any other university.

It is now forwarded for the award of the Ph.D. degree in Urdu language and literature.

| **Prof. Khursheed Ahmad**<br>(Chairman) | **Prof. Abul Kalam Qasmi**<br>(Supervisor) |
|---|---|

اپنے دادا

**حاجی عبدالرزاق مرحوم**

کے نام

جنہوں نے پوری توجہ سے مجھے زبان کی تعلیم دی

اللہ ان کے درجات بلند کرے!

●●●

بِسمِ اللهِ الرّحمٰنِ الرِّحِیم

# مقدّمہ

# مقدمہ

لسانی تشکیل کی تفہیم اور زبان کی تاریخ کا تعیّن ایک پیچیدہ عمل ہے۔ ماہرین کے درمیان اس مسئلہ پر ہمیشہ سے اختلاف رہا ہے کہ کسی زبان کی تشکیل کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں۔ کیا مختلف قومیتوں، زبانوں اور تہذیبوں کا اشتراک ایک نئی زبان کی تشکیل کا باعث بن سکتا ہے؟ اگر ہاں تو تاریخ میں بہت سی قومیتوں، زبانوں اور تہذیبوں کے افراد کے تعامل کے سبب نئی زبانیں کیوں وجود پذیر نہیں ہوئیں؟ نیز ان اسباب وعوامل سے قطع نظر کسی زبان کی تشکیل کی اور کیا وجوہ ہو سکتی ہیں؟ ان سوالوں کا اطلاق اردو زبان پر بھی ہوتا ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب کی جستجو میں ہم ایک نئے علم سے متعارف ہوتے ہیں جسے لسانیات کہا جاتا ہے۔ لسانیات کا مقصد کسی زبان کے جاننے اور سیکھنے سے نہیں بلکہ کسی زبان کے متعلق جاننے سے ہے۔ اس کے تحت زبانوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے، اس کی باہمی مماثلتیں اور ارتباط، معنوی ساخت اور اور ظاہری تقسیم اور گروہ بندی کے بعد اس کی تاریخ متعین کی جاتی ہے یہی لسانیات کا منصب اور دائرۂ کار ہے۔

اردو زبان کی لسانی تاریخیں علم زبان کی روشنی میں ہی لکھی جانی چاہیے۔ ہم جب بھی اردو زبان کی لسانی تاریخوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس کتاب میں اردو کی تاریخ تحریر کرنے کے لیے لسانی طریقۂ کار کا استعمال کیا گیا ہو۔ اردو زبان کی تاریخ اگر چہ بہت پرانی ہے لیکن اس سے متعلق مباحث اور اور نظریات کی تاریخ بہت مختصر ہے۔ اس کی کل عمر دو سو سال یعنی انیسویں اور بیسویں صدی کو محیط ہے۔ شروع میں اہل اردو بشمول مستشرقین کا خیال تھا کہ اردو ایک ملغوبہ زبان ہے جس کا آغاز ہندوستان میں مسلمانوں کے توطن اختیار کرنے کے بعد ہندوستانی زبانوں میں دیگر زبانوں مثلاً عربی، فارسی، ترکی کی آمیزش سے ہوتا ہے۔ بعد میں بعض مستشرقین نے اپنے خیالات میں ترمیم کی لیکن مذکورہ خیال کے تکرار میں تقریباً ایک صدی بیت گئی اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال عقیدے کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس نوعیت کے خیالات پیش کرنے والوں میں میر امن، انشا، سرسیّد، امام بخش صہبائی، ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کیاوائل کے اردو سے متعلق مسائل اور مباحث کا مدلل اور لسانی انداز حافظ محمود شیرانی اور محی الدین قادری زورؔ کی تحریروں میں اختیار کیا گیا۔اسی صدی کے وسط میں مسعود حسین خاں اور شوکت سبزواری کی لسانی تحقیقات بھی منظر عام پر آئیں۔ان حضرات کے بعد گیان چند جین، سہیل بخاری اور دیگر کئی حضرات نے اس موضوع پر تحقیقی نقطۂ نظر سے غور وخوض کیا۔ان محققین کے ساتھ مستشرقین میں جیولس بلاک، گریرسن، گراہم بیلی، جان بیمز، وغیرہ نے بھی نے بھی اس ضمن میں اپنے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔

اس مقالہ کا موضوع اردو زبان کی تاریخ نہیں بلکہ تاریخ پر لکھی گئی کتابیں ہے۔زبان کی تاریخ پر گفتگو کرتے ہوئے ہمارے ذہن میں مجموعی طور پر تین سوالات پیدا ہوتے ہیں۔زبان کیا ہے؟اس مخصوص زبان کا آغاز کہاں اور کب ہوا؟ اوراس کے ارتقا کی داستان کیا ہے؟ان سوالات کے پیش نظر تھے ہم نے مقالے کو پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے۔پہلا باب بالعموم زبان سے متعلق ہےاس کے تحت زبان کی تعریف، اس کی ماہیت، اہمیت اور علم اللسان اوراس کی افادیت سے گفتگو کی گئی ہے۔زبان اظہار کا بہترین وسیلہ تو ہے ہی اس کے علاوہ یہ ایک سماجی اور تہذیبی مظہر بھی ہے۔زبان سماج میں پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے۔علوم وفنون کا ذریعہ ہونے کے ساتھ تہذیب سے اس کا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔زبان ہمارے معاشرتی رابطوں کی شکل متعین کرتی ہے۔زبان کے تمام عوامل کا مطالعہ ہم لسانیات کے تحت کرتے ہیں۔دوسرے باب میں لسانی گروہ اوران کے جغرافیائی حلقۂ اثر کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔اردو چوں کہ ''ہند آریائی'' خاندان کی زبان ہے جس کا براہِ راست تعلق زبانوں کے ''ہند یوروپی'' خاندان سے ہے اس لیے ہندوستان میں ہند آریائی زبان کے ارتقا اور آریوں کی آمد سے متعلق اس ضمن میں تفصیلی گفتگو پیش کی گئی ہے۔ہند آریائی زبانوں کی عہد بعہد کی تاریخ بھی پیش کی گھی ہے اور جدید ہند آریائی کی مغربی ہندی سے اردو زبان کا آغاز وارتقا دکھایا گیا ہے۔متذکرہ دونوں ابواب کا تعلق خالصتاً لسانیات اور تاریخ سے ہے۔ اس لیے یہ کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک ہو سکے تاریخ اور لسانیات کی معتبر اور مستند کتابوں سے استفادہ کیا جائے اور ان مسائل سے متعلق تسلیم شدہ حقائق پیش کیے جائیں۔یہ ابواب اس موضوع کے لیے اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ان باابواب کے مباحث آیندہ ابواب کی تفہیم میں معاون ثابت ہوں گے۔

تیسرے باب سے مقالہ کے موضوع کی با قاعدہ ابتدا ہوتی ہے۔ یہ باب انیسویں صدی میں پیش کی گئی ان تحریروں پر مشتمل ہے جن میں اردو کوملواں زبان کہا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان تحریروں کا نہ تو کوئی لسانی جواز تھا اور نہ کوئی تحقیقی بنیاد۔ اس لیے ہمارے ماہرین ایسی تحریروں کو غیر سنجیدہ تحریروں کے خانہ میں رکھتے ہیں بلکہ بعض کا خیال ہے کہ کسی علمی کتاب میں ایسی تحریروں کا ذکر تک نہیں آنا چاہیے۔ لیکن اردو زبان کی لسانی تاریخوں کے ضمن میں انہیں ابتدائی نقوش یا بزرگوں کے تبرک کی حیثیت سے شامل کرنا چاہیے۔ یہ ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ انہیں تحریروں نے بعد میں ماہرین کو مہمیز کیا اور با قاعدہ لسانی تاریخوں کی تصنیف کے لیے محرک ثابت ہوئیں۔

تیسرا اور چوتھا باب بیسویں صدی کی لسانی تاریخوں پر مشتمل ہے جسے آسانی کے لیے بیسویں کے نصف اول اور دوم میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایسا نہیں کہ بیسویں صدی میں اردو زبان کی تاریخ سے متعلق جتنی کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں ان سب میں لسانی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہو۔ ابواب کی تقسیم زمانی اعتبار سے کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ''نقوش سلیمانی'' کی اشاعت ۱۹۳۹ء تک ایسی متعدد تحریریں ملتی ہیں جن کا رویہ غیر لسانیاتی ہے۔ مقالہ میں ان میں سے صرف چند کا ذکر کیا گیا باقی نظر انداز کر دی گئیں۔ ان دونوں ابواب میں بالخصوص لسانیاتی نوعیت کی قابل ذکر تصانیف کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس فہرست میں پنجاب میں اردو، ہندوستانی لسانیات، مقدمہ تاریخ زبان اردو، اردو زبان کا ارتقا، داستان زبان اردو، اور اردو کی لسانی تشکیل وغیرہ شامل ہیں۔ ان کتابوں کے مفصل بیان اور ان کی تحقیق اور تنقید سے اس موضوع کا احاطہ ہوتا ہے۔ پانچویں باب کے آخری صفحات میں گیان چند جین کی تصنیف ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' بھی شامل کر لی گئی ہے جو صرف عنوان کی حد تک اردو زبان کی تاریخ ہے۔ سب سے آخر میں نتائج کا محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے سیکڑوں سال کی اردو زبان کی تاریخ اور دو سو سال کے عرصے میں لکھی گئی تاریخیں وقت کے ساتھ ساتھ کس طرح رنگ بدلتی نظر آتی ہیں ان کا بیان پیش کیا گیا ہے۔ موضوع کے تکمیل میں جتنی معاون کتب دستیاب تھیں اور ان سے استفادہ کیا گیا ہے اور ان کی فہرست شامل کر دی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لسانیات ایک خشک موضوع ہے اس بات میں کچھ تو صداقت ہے لیکن زیادہ تر مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ موضوع مشکل ہے اور دلچسپی کا معاملہ آسانیوں پر محمول ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی

بھی علم کا ذریعہ زبان ہوتی ہے لیکن ادب سے اسے خاص لگاؤ ہے۔اس لیے ادب کے طالب علم کی حیثیت سے زبان کی حقیقت، ماہیت اور اس کی تاریخ سے واقفیت بھی بہت اہم مسئلہ ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا بڑا کرم و احسان ہے کہ یہ مقالہ تکمیل کو پہنچا۔ کام قدرے دشوار تھا ابتدا میں مزاج کو موضوع سے یگانگت کم تھی خود اور موضوع کو ایک دوسرے سے مانوس کرتا گیا۔ استاذ محترم سے مختلف نکات پر بحث و تمحیص اور گفتگو کا سلسلہ جاری رہا موضوع پر گرفت بڑھتی گئی اور کام آسان ہوتا گیا۔

کلمات تشکر الفاظ میں رسم بن جاتے ہیں لیکن یہ رسم فرض کے مترادف ہے۔ اس وقت سوائے اس کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ: ع ہم کہاں کہ دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے ،ممنون کرم ہوں استاد محترم پروفیسر ابوالکلام صاحب قاسمی کا کہ انہوں نے مجھے اپنے حلقۂ تلامذہ میں شامل کیا اور مستقل تربیت فرما کر اس قابل بنایا کہ اکیڈمکس کی ہائیر ڈگری کے لیے اس مقالہ کی تکمیل کر سکا، اور ایک بڑی ذمہ داری سے سبک دوش ہو سکا۔

صدر شعبۂ اردو، استاد پروفیسر خورشید احمد صدیقی صاحب کا شکریہ جنہوں نے ہر موقع سے میرے ساتھ شفقتوں اور محبتوں کا سلوک کیا ہے۔ میں مشکور ہوں اپنے شعبے کے تمام اساتذۂ کرام کا بالخصوص استاد امتیاز احمد صاحب (بھائی) کی سوالیہ نگاہوں اور بے پناہ شفقتوں کا۔ میں ممنون کرم ہوں خالد بھائی، محمد سجّاد بھائی اور حمیرہ آپا کا کہ ان لوگوں نے میرے کام کے سلسلے میں ہمیشہ ایک خاص قسم کی وابستگی کا احساس دلایا۔ میں مشکور ہوں عثمانی بھائی، محمد مشاہد بھائی، ناصر بھائی اور شمیم بھائی کی محبتوں کا۔

الفاظ قاصر ہیں اور زبان گنگ یہ دعا ہے اللہ پاک سے کہ ابّو اور امی کی عمریں دراز ہوں جن کا کل سرمایہ ہمارے گھر کا تعلیمی ماحول رہا ہے۔ بھائی، بہنوں، بھابیوں، عارف بابو یعنی بہنوئی صاحب اور بچے مہ جبین فاطمہ، طلعت اور ارم کے جذباتی و اخلاقی تعاون کے ذکر کے بغیر یہ گفتگو نا تمام رہے گی۔

کسی سے ایک ملاقات میرے تعلقات میں ایک آدمی کا اضافہ کرتی ہے، میں مشکور ہوں ایسے تمام متعلقین اور محبین کا اور بطور خاص اپنے بے حد قریب......امجد، شاہ عالم، خورشید بھائی، جاوید، آفتاب عالم، اشرف، توصیف الرحمٰن، شاہین اقبال، منظور، اقبال، مہتاب عبدالحفیظ، خالد، آفتاب نجمی، نہال چند لاہوری، راشد، ذاکر حسین، صدر عالم اور شارق کا کہ انہیں مجھ سے ایک خاص تعلق خاطر ہے۔

شکریہ اپنے بے حد مخلص، سینئر فرینڈ فہیم بھائی، حیدر بھائی، معراج بھائی، جلال الدین بھائی، منہاج بھائی اور آصف بھائی کا کہ ان حضرات کی صحبت سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

"To Name a relationship is to kill it" مسرت پروین، صبیحہ فاطمہ، ع اوراب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے''۔ ذاکرہ اور مومنہ وسیم اس ایک نام میں دو کی گنجائش موجود ہے اور فرہین خورشید کا کہ ان کے ذکر کے بغیر ایک کمی رہ جائے گی جس کی تلافی عمر بھر ممکن نہیں۔

●

محمد بکر عالم صدیقی

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

# باب اوّل

## زبان : تعریف اہمیت اور علم اللسان

## زبان کی تعریف اور اس کی اہمیت:

زبان کیا ہے؟ جب ہم اس لفظ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم جس مفہوم میں اسے برت رہے ہیں اس کا واضح یا غیر واضح تصور ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ لیکن اگر ہمیں زبان کی جامع اور مانع تعریف کے لئے کہا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ دوسرے علوم کے بنیادی تصورات کی طرح اس اصطلاح کی تعریف کس قدر مشکل ہے۔ پھر بھی عام طور پہ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ زبان انسان کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ یوں تو اظہار خیال کی کئی صورتیں ممکن ہیں مثلاً ''زبان قال'' یعنی ناطقۂ انسانی کی آوازیں (Vocal Sounds) اور ''زبان حال'' یعنی جسمانی اشارے (Gestures) ایک تیسری شکل تحریر کی بھی بتائی جاتی ہے لیکن عام طور پر اس کا اطلاق زبان کے معنوں میں نہیں ہوتا ہے۔ اصطلاح میں زبان کا مفہوم یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ نطق کی مخصوص آوازوں کا ایسا مجموعہ ہے جسے انسان اپنے ارادے سے نکالتا ہے اور اس کے ذریعے سے اپنے خیالات اور ذہنی کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالقادر سروری کا خیال ہے کہ:

> ''زبان لسانیات کی اصطلاح میں وہ ملفوظ آوازیں ہیں جو انسان اپنے منہ سے ادا کرتا ہے اور جن کے ذریعے سے وہ اپنے مافی الضمیر کو دوسرے پر ظاہر کرتا ہے۔''[1]

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اظہار کا ذریعہ جسمانی اشارہ و کنایہ بھی ہے۔ لیکن اس کا استعمال مخصوص اور متعین معنوں میں ہی ہوتا ہے۔ اشارے کو الفاظ کی نسبت یہ فوقیت حاصل ہے کہ ایک ہی جنبش پورے مدّعا کو ظاہر کر دیتی ہے۔ لیکن واضح طور پر انسانی خیالات کی صحیح ترجمانی کے لئے نطق کی آواز (Vocal Sound) یا قوت گویائی ہی ایک مکمل اور موثر ذریعہ ہے جسے زبان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ زبان یا گویائی کا وسیلہ انسان کا

---

[1] زبان اور علم زبان : پروفیسر عبدالقادر سروری، ص۔۲۰

خاصہ ہے۔اس لئے یہ علماء کے نزدیک ایک وسیع اصطلاح اور مضمون کی صورت اختیار کر چکا ہے۔بحیثیت اصطلاح زبان ایک پیچیدہ موضوع یا مسئلہ ہے۔اس کا مطالعہ علم اللسان کے تحت کیا جاتا ہے۔لسانیات ایک باقاعدہ اور جدید شعبۂ علم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔اگرچہ زبان سے متعلق اظہار خیالات کی جھلک قدیم زمانے میں یونان اور روم کے مفکروں کے یہاں بھی ملتی ہے۔لیکن باقاعدہ طور پر ایک سائنسی علم کی حیثیت سے زبان کے مطالعہ کی ابتدا مغرب میں انیسویں صدی میں ہوئی۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کے ربع ثانی سے ماہرین اس علم کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔اردو میں اس موضوع پر ماہرین کی چند اچھی کتابیں دستیاب ہیں۔لیکن اس بات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اس موضوع پر مغربی ماہرین نے زیادہ توجہ صرف کی ہے اور اردو کی بہ نسبت انگریزی زبان میں اس سے متعلق وافر مواد موجود ہے۔بہ حیثیت مجموعی مطالعۂ زبان پہ مشرق و مغرب کے ماہرین کی ایک طویل فہرست بن جاتی ہے۔ان علماء کی تصانیف کے مطالعے سے لسانیات کے بنیادی اصول اور اس کے مضمرات کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے، ساتھ ہی زبان اور اس سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ان تمام مصنفین نے زبان کی تعریفیں کی ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں اور خصوصیتوں کا احاطہ کرنے کی کوششیں کی ہیں تاہم ماہرین اب تک کسی تشفی بخش نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔

زبان کے مطالعے میں ہمیں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ماہرین 'زبان' کی تعریف کرتے وقت صرف اس امر پر اکتفا نہیں کرتے کہ یہ خیالات کو خوبی کے ساتھ دوسروں پر واضح کر دینے کا موثّر ذریعہ ہے۔ بلکہ اس نوعیت کی کسی ایک تعریف اور اس کی توضیح سے زبان کا جامع اور مکمل تصور واضح نہیں کیا جا سکتا۔اس لئے زبان کی اہمیت اور ماہیت کو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت کو متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہاں اس کی چند جامع تعریفیں پیش کی جائیں اور ان کے ذریعے سے زبان کے اہم نکات پر روشنی ڈالی جا سکے۔اس سلسلے میں مناسب ہوگا کہ مشرق و مغرب کے ایسے علماء کا ذکر کیا جائے جن کی تصانیف لسانیاتی حلقے میں مستند ہیں اور ان کی اہمیت اور افادیت مسلّم ہے۔تاہم اس سے قبل کہ مغرب و مشرق کے علماء کے ذریعے کی گئی تعریفوں پر روشنی ڈالی جائے ''انسائکلوپیڈیا بریٹانیکا'' کی تعریف پر ایک نگاہ ڈالنی زیادہ مناسب ہوگی۔

"Language is the system of conventional spoken or written symbols by means of which human beings, as memeber of a social group and participants in its culture, comunicate." [۲]

''زبان بولی یا لکھی جانے والی علامتوں کا وہ مسلمہ طریقۂ کار یا نظام ہے، جس کے ذریعہ انسان یعنی کسی معاشرے یا تہذیب کے افراد آپس میں اظہار خیال کرتے ہیں۔''

مذکورہ بالا تعریف کی تشریح یا توضیح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ زبان با قاعدہ آوازوں پر مشتمل لفظوں یا علامتوں کا ایک ایسا تسلیم شدہ نظام ہے جس کا اپنا مخصوص معنوی دائرہ ہوتا ہے۔ اس میں ہماری اپنی وضع کردہ علامتیں یا الفاظ مختلف ضروریات اور حالات کی مناسبت سے استعمال ہوتے ہیں۔ معاشرے یا تہذیب کے افراد ان علامتوں کے معانی اور الفاظ کی صورت حال سے باخبر ہوتے ہیں اور انہیں حسب ضرورت اپنے مافی الضمیر کی ترسیل کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ انسائکلو پیڈیا بریٹانیکا کے مضمرات کو سمجھنے کے بعد لسانیات کے بعض ماہرین کی وضع کردہ تعریفوں کو بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سب سے پہلے ایک جدید ماہر زبان ایڈورڈ ساپر کی تعریف پیش کی جاتی ہے۔

"Language is purely human and non-instinctive method of communicating ideas, emotions and desires by means of a system of voluntarily produced symbols" [۳]

''زبان خالصتاً انسانی مگر غیر جبلی طریقۂ کار ہے، تا کہ اس کے وسیلے سے خودساختہ علامتوں کے نظام میں اپنے خیالات، جذبات اور خواہشات کا اظہار کیا جا سکے۔''

ایڈورڈ ساپر کی تعریف کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ اس نے اپنی تعریف میں زبان کے چار نکات یا خصوصیات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان خصوصیات کی وضاحت سے زبان کی حقیقت اور ماہیت کو سمجھنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ سب سے پہلے مذکورہ تعریف کو اگر اس طرح بیان کیا جائے۔

---

۲ انسائکلو پیڈیا بریٹینیکا، ص۔۱۴۷، جلد۔۷، شکاگو یونیورسٹی

۳ لینگویج : ایڈورڈ ساپر، ص۔۸

(۱) زبان انسان کے خیالات وخواہشات کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ اس موضوع پر گفتگو یہیں سے شروع ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ زبان کی Ultimate خوبی ہے۔

(۲) یہ انسان کا خاصہّ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان ہی اس بات پر قادر ہے کہ وہ اپنے جذبات وخیالات کا اظہار قوت گویائی کے وسیلے سے جس طرح چاہے کرسکتا ہے۔

(۳) زبان انسان کو فطرتاً یا ورثے میں نہیں ملتی ہے۔ یہ غیر جبلی طریق کار اور ایک طرح کا اکتسابی عمل ہے۔ اس کا سیکھنا اور بولنا انسان کی بالا رادہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انسان اپنی مرضی سے جب اور جہاں چاہے کسی بھی زبان کو سیکھ اور بول سکتا ہے اور اسے کام میں لاسکتا ہے۔ غیر جبلی طریق کار سے سا پر کی مراد یہی ہے کہ بچے کے اندر وقتِ پیدائش سے ہی گفتگو کرنے کی قابلیت موجود تو ہوتی ہے، لیکن وہ کسی بھی زبان کے استعمال سے قاصر ہوتا ہے۔[۱۲] اس کی جسمانی اور دماغی ساخت اس قابل نہیں ہوتی کہ کسی زبان کے الفاظ و علامت کو اپنی گرفت میں لے کر اس سے کام لے سکے۔ بچّے کی یہ صلاحیت جسے (Physiological Growth) کہا جا سکتا ہے، بہت ہی آہستہ ترقی کرتی اور بڑھتی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ان صلاحیتوں کا استعمال بھی اسی نہج پر ہوتا ہے۔ اس طرح بڑھتی عمر کے ساتھ ہی بچوں میں اشیاء یا حالات کو سمجھنے اور ان کے مشاہدے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس معاشرے میں بولی جانے والی علامتوں اور الفاظ کی نوعیت سے واقف ہوتا ہے۔ اس طرح بچہ زبان اسی معاشرے سے سیکھتا ہے جہاں کا وہ پروردہ ہوتا ہے۔ زبان سیکھنے کا یہ عمل صرف بچّوں پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ اسی عمل کو بروئے کار لا کر انسان دیگر زبانوں پر بھی دسترس حاصل کرسکتا ہے۔ یہاں ایک بات توجہ طلب ہے کہ اگر زبان کا سیکھنا اور بولنا فطری عمل ہوتا تو زبانیں اس قدر مختلف نہیں ہوتیں۔ بلکہ فطرت کا عطیہ سب کو برابر ملتا اور پوری دنیا میں ایک ہی زبان مستعمل ہوتی۔

(۴) زبان، مسلمہ نظام کے تحت خود ساختہ علامتوں یا الفاظ کے استعمال کا نام ہے۔ متذکرہ تعریف کے اس حصّے کی تفصیل اور وضاحت کے لیے سر دست مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک ممتاز

---

[۱۲] سیّد محی الدین قادری زور: ہندوستانی لسانیات، ص۔ ۲۸

ماہرِ زبان Robins کے ذریعہ کی گئی تعریف پیش جائے۔ اس کی تعریف میں بھی کچھ ایسے ہی خیالات پیش کیے گئے ہیں جس سے مذکورہ بالا تعریف کی تصدیق اور توثیق ہوتی ہے۔ رابنس نے زبان کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے۔

"Language is a symbol system based on pure or arbitrary convention......infinetly extendable and modifiable acording to the changing needs and conditions of the speakers" ۵

''زبان خودارادی علامتوں پر مبنی ایک مقررہ طرزِ اظہار ہے، جو بولنے والوں کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق لائق توسیع و ترمیم ہوتا ہے۔''

رابنس کی تعریف کا پہلا حصہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ زبان کا اپنا علامتی نظام ہوتا ہے۔ یعنی زبان نظام ہائے اصوات و نحویات سے ہی وجود میں آتی ہے۔ مثلاً دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان سب کا اپنا علیحدہ اور مخصوص علامتوں اور الفاظ کا معنوی نظام ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ کسی بھی نظام کی کلیت کا انحصار اس کے اجزاء کی مناسب ترتیب و تنظیم اور آپسی تال میل پر ہوتا ہے۔ اسی لیے زبان کی باقاعدہ تعریف " Language is the system of systems " بھی بیان کی جاتی ہے۔ ٦

گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی مفصل گفتگو کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر زبان میں مخصوص آوازوں سے اشیاء کے لئے مخصوص الفاظ و علامتیں وضع کی جاتی ہیں۔ ان میں آوازوں کی ترتیب و تنظیم اور ربط و آہنگ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ آوازیں اینٹ کی مانند نہیں ہوتیں جن کی ترتیب کا خیال کئے بغیر کہیں بھی رکھ کر خوبصورت دیواریں یا عمارتیں تعمیر کر لی جاتی ہیں۔ بلکہ ان آوازوں کا استعمال مخصوص، منظّم اور مسلّمہ طریقۂ کار کے تحت ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے سے بامعنی الفاظ اور جملوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور اسے مخصوص انسانی گروہ میں سمجھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا یہ ایک لسانی مفاہمہ ہے۔

---

۵ جنرل لنگوسٹکس : آر۔ ایچ۔ رابنس، ص۔ ۲

٦ این انٹروڈکشن ٹو لنگوسٹکس : پی۔ سیال اینڈ، ڈی۔ وی۔ جندل، ص۔ ۷

خودساختہ علامتوں یا الفاظ سے مصنف کی مراد یہ ہے کہ انسان نے الفاظ اپنے مافی الضمیر کی ترسیل کے لئے وضع کیے ہیں۔ اشیاء اور ان کے نام میں بالذات کوئی رشتہ نہیں ہوتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ مختلف زبانوں میں کسی ایک ہی چیز کے لئے مختلف الفاظ اور علامتیں موجود ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ زبان کی ابتدائی صورت ہی یہ تھی کہ کسی مخصوص چیز کے لئے کوئی علامت متفقہ طور پہ وضع کر لی گئی ہو اور وہی آواز یا علامت انسان کے مابین اشیا کے نام کی حیثیت سے رائج ہوگئی ہو۔

متذکرہ بالا تفصیلات کے علاوہ Robins کا یہ فقرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ یہی الفاظ بولنے والے (Speakers) کی بدلتی ضرورتوں کے مطابق لائق توسیع و ترمیم ہوتے ہیں۔ یہاں رابنس کے خیال کی وضاحت یوں بھی ہو جاتی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ الفاظ صرف اپنے وضع کردہ معنوں میں ہی استعمال ہوں۔ بلکہ بہ اعتبار ضرورت انہیں مرادی یا دیگر معنوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ زبان کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ معاشرے کا ہر فرد الفاظ کے ایسے معانی، باریکیوں اور اس کی کائنات سے واقف اور باخبر ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ مذکورہ تعریف کے مطابق الفاظ میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ وہ بدلتی ہوئی ضرورتوں کے اعتبار سے اپنا مفہوم تبدیل کرتے ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ماہر لسانیات الفاظ کے استعمال کی دو صورتیں (۱) لغوی (Denotative) اور (۲) مرادی (Connotative) بیان کرتے ہیں۔ اس طرح مذکورہ بالا تعریف کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی زبان کا روزمرہ ہو یا اس کا ادب دونوں صورتوں میں زبان کی اس خصوصیت کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ اگر ہم ادب کے حوالے سے اس طرح کی مثالیں پیش کرنا چاہیں، مثلاً گل و بلبل، عاشق اور معشوق کے لئے، سرو، قد کے لئے، آفتاب، عارض کے لئے وغیرہ الفاظ ہماری شاعری میں مستعمل ہیں۔ اپنے لغوی یا حقیقی معنوں میں ایسے الفاظ اور ان کے مطالب کے مابین کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ پھر بھی شاعری کی مسلمہ روایت کا حصہ بن جانے کی وجہ سے ہر پڑھنے والا ایسے الفاظ سے وہی مطلب مراد لیتا ہے جو لکھنے والے کا مقصد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں متذکرہ سیاق سے الگ غالب کا ایک شعر نقل کیا جاتا ہے جس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ کھلنا کا استعمال اپنے لغوی معنی میں نہ ہوکر مرادی معنی ''ظاہر ہونے'' کے مفہوم میں ہوا ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ مذکورہ شعر میں اس کی کیا اہمیت ہے تاہم زبان کے لحاظ سے اس لفظ کی وسعت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لفظ ''کھلنا'' سے ظاہر ہونے کے معنی مراد لینا ہماری شاعری کی روایت کا حصہ نہیں ہے بلکہ زبان کے لائق توسیع (Extendable) اور لائق ترمیم (Modifiable) ہونے کی دلیل ہے۔ زبان کے لیے مذکورہ دونوں اصطلاحوں کی اہمیت کا اندازہ اس وقت لگایا جاسکتا ہے جب کسی دقیق مسئلے پر بھی خوبی کے ساتھ خیال کی ترسیل آسان ہو جائے۔ یعنی اس سے زبان میں لچیلا پن پیدا ہوتا ہے اور بولنے والا (speaker) اپنی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے اعتبار سے اس کا استعمال کرتا ہے۔

بحیثیت اصطلاح، مطالعۂ زبان کو ماہرین نے اس قدر وسعت دی ہے کہ نہ تو کسی ایک تعریف کو بنیاد بنا کر زبان کی تمام تر خصوصیات اور اس کی اہمیت کا احاطہ ممکن ہے اور نہ ہی کسی ایک پر اکتفا کر کے اس کی قدر و قیمت متعین کی جاسکتی ہے۔ بلکہ اہم ماہرین اور ان کے خیالات سے کسب فیض کرنا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ زبان کی خصوصیات واضح ہوسکیں۔ یہاں ایک اور ماہر لسانیات نوم چامسکی (Noam chomski) کے خیالات کا ذکر نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ عہد حاضر کے بڑے ماہر زبان ہیں۔ جدید لسانیات کی تاریخ ان کے نام کے بغیر نامکمل رہے گی۔ انہیں لسانیات کا آنسٹائن کہا جاتا ہے۔[۷] ان کا شمار صف اول کے مفکرین میں ہوتا ہے۔ ان کے ذریعہ کی گئی زبان کی تعریف ملاحظہ فرمائیں:

" A language is a set (finite or infinite) of sentences, each finite in length and constructed out of a finite set of elements." [۸]

---

۷ اردو کا المیہ: مسعود حسین خاں، مرتب۔ مرزا خلیل احمد بیگ، ص۔ ۲۴۹
۸ سنٹیکٹک اسٹرکچر: نوم چامسکی، ص۔ ۱۳

''زبان (محدود یا لامحدود) جملوں کا مجموعہ ہے۔ یہ جملے (زبان کی) مقررہ علامتوں اور عناصر سے بنائے جاتے ہیں''۔

Chomskey کے مطابق کسی بھی جملے کی اپنی ساخت ہوتی ہے اور یہ جملے زبان کی مقرّرہ علامتوں کی ترتیب سے وجود میں آتے ہیں۔ دیگر ماہرین کی طرح چامسکی کے یہاں بھی اس بات پہ اصرار ملتا ہے کہ ہر زبان کی کچھ مقررہ آوازیں اور علامتیں ہوتی ہیں جس پہ اس زبان کا نظام قائم رہتا ہے۔ لیکن Chomskey نے جس بات کا ذکر بطور خاص اپنی تعریف میں کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی ذہن اس قدر تخلیقی ہوتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے اسی مخصوص زبان کے محدود الفاظ یا علامتوں کے ذخیرہ سے بے شمار جملوں کی تشکیل اور تخلیق کر لیتا ہے۔ بلکہ ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ بچے کا ذہن اس قدر تخلیقی اور متجسس ہوتا ہے کہ وہ ایسے جملے بھی خلق کر لیتا ہے یا جملے کی نئی ساخت کے تجربے کرتا ہے جس سے وہ قطعی طور پر نا مانوس اور نا بلد ہوتا ہے۔ یعنی متذکرہ تعریف کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زبان کے محدود الفاظ یا علامتوں سے لامحدود جملے بنائے جا سکتے ہیں اور زبان ایسے ہی جملوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں اسی نوعیت کی چند اور تعریفیں پیش کی جاتی ہیں جن میں زبان کی مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ملاحظہ فرمائیں۔

"A language is system of arbitary vocal system by means of which a social group cooprates."(Block and Trager) [۹]

''زبان من مانی نطق کی آوازوں یا علامتوں کا ایک آئین مقررہ ہے جس کے وسیلے سے کسی بھی معاشرے کے افراد آپس میں اظہار خیال کرتے ہیں''۔

"A language is system of arbitrary vocal symbols used for human communication"(wardaugh) [۱۰]

---

۹ آؤٹ لائن آف لینگوسٹک اناسس : بلاک اینڈ ٹریگر، ص ص۔ ۵،۴

۱۰ این انٹروڈکشن ٹو لنگوسٹک : وارداـ آر، ص۔ ۱۱

"Language is undoubtedly kind of menas of communication among human beings. It consist primarily of vocal sounds. It is articualtory, systematic, symbolic or arbitary " (Derbyshrine, A .E) [11]

''زبان بلاشبہ انسان کے لئے اظہار کا وسیلہ ہے۔ اس کی ابتدائی صورت آوازوں کا مجموعہ یا مرکب ہے۔ یہ واضح من مانی علامتوں کا مخصوص نظام ہے''۔

"Language is primarily made up of vocal sounds only produced by a physiological articulatory mechanism in the human body. In the begining, it must have appeared as vocal sounds only . [12]

مغربی علماء کی مذکورہ بالا تعریفوں کو پیش کرنے اور ان کی تشریح اور توضیح کے ساتھ مناسب ہے کہ اردو زبان کے ماہرین کے خیالات سے بھی استفادہ کیا جائے۔ یوں تو ابتدا سے ہی اردو میں زبان کے سائنسی مطالعہ کا رجحان کم رہا ہے پھر بھی اتنا مواد ضرور دستیاب ہے کہ اس سے خاطر خواہ کسب فیض کیا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک جانب اگر ہمیں یہ اعتراف ہے کہ زبان سے متعلق علم و آگہی کا زیادہ تر ذخیرہ مغربی مفکرین نے فراہم کیا ہے تو اس کے ساتھ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں ابتدا تا حال اردو میں ایسی متعدد تحریریں اور تصانیف دستیاب ہیں جو اس موضوع سے متعلق اہم اور قابل ذکر ہیں۔ اس لئے مشرقی علماء کے تصورات کو سمجھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مغربی علماء کے خیالات سے کسب فیض کیا گیا ہے۔ اس لیے آئیے اردو زبان کے علماء کی تعریفوں پر ایک نظر ڈالی جائے تا کہ ان حضرات کے خیالات سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ تعریف پیش کی جاتی ہے جو مولانا محمد حسین آزاد نے کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''زبان وہ اظہار کا وسیلہ ہے کہ متواتر آوازوں کے سلسلے میں ظاہر ہوتا ہے۔ جنہیں تقریر یا سلسلۂ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں۔ اسی مضمون کو

---

[11] این انٹروڈکشن ٹو لنگوسٹکس : پی۔ سیال اینڈ، ڈی۔ وی۔ جندل، ص۔ ۴

[12] ایضاً، ص۔ ۷

ایک شاعرانہ لطیفے میں ادا کرتا ہوں کہ زبان (خواہ بیان) ہوائی سواریاں
ہیں جن میں ہمارے خیالات سوار ہو کر دل سے نکلتے ہیں اور کانوں کے
رستے اوروں کے دماغوں میں پہنچتے ہیں۔اس سے رنگین تر مضمون یہ ہے
کہ جس طرح تصویر اور تحریر قلم کی دستکاری ہے جو آنکھوں سے نظر آتی
ہے، اسی طرح تقریر ہمارے خیالات کی زبانی تصویر ہے جو آواز کے قلم
نے ہوا پر کھینچی ہے۔ وہ صورتِ ماجرہ، کام، مقام اور ساری حالت کانوں
سے دکھاتی ہے۔''[۱۳]

محمد حسین آزاد کی تعریف کے علاوہ ایسے علماء کی تعریفیں بھی ملتی ہیں جنہیں لسانیاتی مطالعے سے حد درجہ دلچسپی تھی ۔ ان حضرات نے بھی اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا نام اس قبیل میں سرِفہرست آتا ہے۔ یہاں ان کی تعریف کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

''پس زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ زبان انسانی
خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں
اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن
کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادہ سے
دہرا سکتا ہے۔''[۱۴]

مذکورہ تعریف میں غور طلب بات یہ ہے کہ محی الدین قادری زور نے زبان کی دونوں صورتوں یعنی نطق کی آوازوں اور جسمانی حرکتوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ ان صورتوں کو ہم خیالات کی ترسیل کے لئے شعوری طور پر استعمال کرتے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں اس سے متعلق چند باتیں عرض کی جا چکی ہیں۔ اس لئے یہاں مزید تفصیل بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ موصوف کی یہ تعریف مکمل اور جامع نہیں کہی جا

---

۱۳؎ سخندان فارس : محمد حسین آزاد، ص۔۶،۵

۱۴؎ ہندوستانی لسانیات: سیّد محی الدین قادری زور، ص۔۲۶

سکتی ہے۔ کیوں کہ اس میں زبان کی مختلف باریکیوں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے جن کا شمار زبان کی مختلف خصوصیات اور اس کے وجود پذیر ہونے کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ محی الدین قادری زورؔ کی نظر میں زبان کی ماہیت کیا ہے اس کی تفصیلات ان کی تحریروں میں تلاش کرنا زیادہ مناسب ہے۔ زبان کی وضاحت کرتے ہوئے وہ مزید فرماتے ہیں:

''زبان کی یہ خصوصیت نہایت اہم ہے کہ وہ صرف انسان ہی کو حاصل ہے اور جاہل سے جاہل بلکہ وحشی سے وحشی قبیلوں کے انسان بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔ حالانکہ دوسرے حیوانات خواہ ان کی فہم و استعداد کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو، گفتگو نہیں کر سکتے۔ یہ امتیاز ظاہر کرتا ہے کہ تکوین عالم کے وقت پروردگار نے اسی طرح ہم میں بات چیت کرنے کی اہلیت پیدا کی جیسا کہ اس نے ہم میں سانس لینے، چلنے پھرنے اور کھانے پینے کی قابلیت عطا کی۔ یہاں سوال اس قدر باقی رہ جاتا ہے کہ آیا ہم نے اسی طرح گفتگو کرنا شروع کر دیا جس طرح سانس لینے لگے تھے یا......جیسے کہ ہم اپنے جسم کو محفوظ رکھنے کے لئے کپڑوں کا استعمال کرتے ہیں۔.......
جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس طرح غیر ارادی طور سے سانس لینے لگتا ہے اسی طرح گفتگو نہیں شروع کر دیتا۔ اگر چہ اس میں پہلے ہی سے پروردگار نے گفتگو کرنے کی قابلیت ودیعت کر دی ہے۔
.......غرض انسان میں زبان سے کام لینے کی استعداد اس کی خاص فطرت کی طرح یقیناً ایک ودیعت الٰہی ہے۔ مگر زبان اس حد تک انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ وہ اس خداداد قابلیت کو اپنی فطرت اور عضوی خصوصیت کی مدد سے ظاہر کرتا ہے۔'' ۱۵

---

۱۵ ہندوستانی لسانیات: سیّد محی الدین قادری زورؔ، ص۔ ۲۷، ۲۸

مندرجہ بالا تعریفوں اور ان کی مزید توضیحات کی روشنی میں زبان کی ماہیت ایک حد تک واضح ہو جاتی ہے۔آخر الذکر اقتباس کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو نا مناسب نہیں ہوگا کہ گذشتہ صفحات میں جتنی بھی تعریفیں پیش کی گئی ہیں، محی الدّین قادری زور کے متذکرہ بالا الفاظ ان کا خلاصہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی اس گفتگو کی روشنی میں یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ انسانی خیالات کی ترسیل کا یہ ذریعہ اپنے آپ میں مکمل اور موثرِ ہے۔ ماہرین کی فہرست میں ایک اور اہم نام سیّد احتشام حسین کا ہے۔ اردو زبان وادب کی تاریخ اور تنقید پہ ان کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔صرف اردو زبان کی تاریخ کے حوالے سے ان کا بے حد اہم کام جان بیمز کی تصنیف "An outline of Indian Philology" کا ترجمہ ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' حواشی اور بسیط مقدمے کے ساتھ ۱۹۴۸ء شائع ہوا۔اس سلسلے کی دوسری کڑی ''اردو کی کہانی'' یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۶ء میں منظر عام پر آئی پھر اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔اردو زبان وادب کی تاریخ انہوں نے ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' کے نام سے تصنیف کی۔ انہوں نے اوّل الذکر کتاب یعنی خاکہ کے ترجمے میں زبان کی تعریف اور اس کی ماہیت پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہاں اس گفتگو کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

> ''زبان آوازوں کے ایک ایسے مجموعے کا نام ہے جسے انسان اپنا خیال دوسروں پر ظاہر کرنے کے لئے ارادتاً نکالتا ہے۔ان آوازوں کے معنی معین کر لئے جاتے ہیں تا کہ کہنے اور سننے والے کے یہاں ایک لفظ سے تقریباً ایک ہی طرح کا جذبہ پیدا ہو۔الفاظ ان ذہنی تصویروں کی ملفوظی علامتیں ہیں جنہیں ہم دوسروں کے ذہن تک پہونچانا چاہتے ہیں۔اس طرح زبان ایک بڑا پیچیدہ موضوع بن جاتی ہے کیونکہ کہنے والا ایک میکانکی اور جسمانی ذریعہ سے (یعنی آوازوں کی مدد سے ) سننے والے کے دماغ میں ایک نفسیاتی کیفیت پیدا کرتا ہے اور زبان، تالو، حلق، دانت، ہونٹ اور پھیپھڑے کے مرکب اور پیچ در پیچ عمل سے دماغ کے وہ حصے

تقریباً یکساں طور پر اثر پذیر ہوتے ہیں جن میں خیال پیدا ہوتے ہیں۔

یہ آوازوں سے بنی ہوئی ملفوظی تصویروں کے معنی جانتے ہیں۔"۱۶

بحیثیت مجموعی متذکرہ بالا تمام تعریفوں کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان تعریفوں کے ذریعے سے زبان کی خصوصیات پہ مختلف زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن ان میں کسی ایک کی بھی جامعیت سے ماہرین مطمئن نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر میں چند پہلوؤں کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے اور ان کے علاوہ دیگر خصوصیتیں نظر انداز کر دی گئی ہیں۔ یا پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کے زبان کی تعریف کرتے وقت ماہرین کے پیش نظر اتنی گنجائش نہیں رہتی کہ کم اور جامع الفاظ میں اس کی تمام خوبیوں کا احاطہ کیا جا سکے۔ حالاں کہ علم زبان سے دلچسپی رکھنے والے افراد ایسی تعریفوں سے یہ توقع کرتے ہیں کہ ان میں زبان کی تمام خوبیاں سمٹ آئیں۔ لیکن حقیقت میں ایسا ہو نہیں سکا اس لئے یہ تعریفیں غیر جامع قرار دی گئیں۔ گذشتہ صفحات میں زبان کی تعریفوں اور ان کی تشریحات و توضیحات کے ساتھ ان پہلوؤں سے متعلق مختصر اشارے کئے گئے ہیں جن کا عام طور پہ زبان کی خصوصیات میں شمار ہوتا ہے۔ ان خصوصیات اور خوبیوں کے بیان سے زبان کی اہمیت واضح کرنے میں مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔ مزید یہ کہ زبان ہماری زندگی کی تہذیب و تنظیم میں کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے اور کتنا اہم کردار ادا کرتی ہے اس کا اندازہ اس کے تفصیلی جائزے کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ زبان کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں بالعموم جو نکات بیان کیے جاتے ہیں ان نکات اور جزیات کو اگر قدرے تفصیل سے ملاحظہ کر لیا جائے تو زبان کے پورے دائرۂ کار کا تعین آسان ہو سکتا ہے۔

## زبان کی ماہیت

۱۔ زبان انسانی خیالات کے اظہار کا وسیلہ ہے۔

۲۔ نطق کی ابتدائی آواز ہے۔

۳۔ اکتسابی عمل یا خود ساختہ اور غیر جبلی طریقہ کار ہے۔

---

۱۶۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ: سیّد احتشام حسین، ص۔۱۹، ۲۰۔

۴۔ الفاظ اور علامتوں کا مقررہ اور مسلمہ نظام ہے۔

۵۔ معاشرے اور تہذیب کو شکل عطا کرتی ہے۔

(۱) انسان کے مابین خیالات کی ترسیل کے مختلف ذرائع ممکن ہیں۔ مثلاً زبان یعنی ناطقۂ انسانی کی وضع کردہ آوازیں (Vocal Sounds)، جسمانی حرکات اور اشارے (Gesture) اور بعض اوقات ان میں تحریریں بھی شامل ہیں۔ حرکات، اشارے یا تحریریں زبان سے متعلق گفتگو میں عموماً بر سبیل تذکرہ ہی شامل کی جاتی ہیں۔ اصل معنوں میں زبان سے مراد قوت گویائی ہوتی ہے۔ اس کے وسیلے سے انسان اپنے احساسات، جذبات اور خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ انسان کے درمیان ترسیل کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ زبان کا مقصد اور اس کی غایت یہ ہے کہ وہ افراد کے درمیان رابطے کا کام کرتی ہے۔ دانشوروں کے نزدیک اس کی اہمیت اس کے مقصد میں ہی مضمر ہے۔

(۲) زبان کی ابتدائی صورت نطق کی آوازیں ہیں۔ نطق سانسوں کو میکانکی طریقے سے آوازوں میں تبدیل کرتا ہے۔ اور پھر یہ تکلمی آوازیں ہوا کے ذریعے سے ہی ہماری سماعت تک پہنچتی ہیں۔ یعنی زبان ناطقۂ انسانی کی پیدا کی ہوئی آوازوں سے تشکیل پاتی ہے۔ اس میں آوازوں کی ترکیب و ترتیب کے کچھ مخصوص اور منظّم طریقے ہیں۔ ان آوازوں پر مبنی ملفوظی علامتوں کو انسانی گروہ میں سمجھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔ انسان اس بات پر قادر ہے کہ وہ جب چاہے اپنے ارادے سے آوازوں میں فرق پیدا کرسکتا ہے، اور ان آوازوں کے مستقل عمل اور مرکب سے وہ بامعنی لفظ یا علامت وضع کرتا ہے۔ ان ممیّز خصوصیات کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ زبان صرف انسانوں کے لئے عطیۂ عظیم ہے۔ یہ انسان اور جانوروں کے بیچ مابہ الامتیاز ہے۔ اسی لیے انسان کو دیگر مخلوقات سے ممیّز کرنے کے لیے حیوان ناطق بھی کہا جاتا ہے۔ حیوانوں کی بھی آوازیں ہوتی ہیں لیکن ان میں کوئی فرق واضح نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حیوانی آوازوں میں ترسیل کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا بلکہ چند مخصوص حالات مثلاً بھوک، غصّہ، ڈر وغیرہ کا اظہار محض ہوتا ہے۔ جب کہ انسان اپنی آوازوں کو نہ صرف منظّم کرسکتا ہے بلکہ حسب ضرورت اس کی نوعیت تبدیل کرسکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ اپنے خیالات یا کیفیات کی ترسیل میں صرف حال کے بیان پر ہی قادر نہیں بلکہ ماضی و مستقبل

کے متعلق بھی اظہار خیال کرتا ہے۔ یہاں ایک امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ایک مخصوص نظریے کے تحت زبان کے تصور میں وسعت پیدا کرنے کے لیے جانوروں کی آوازوں کو بھی شامل کرنے کی وکالت کی گئی اور اس کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ بعض جانوروں کی آوازیں ان کے ہم جنسوں میں جوابی عمل کی محرک ہوتی ہیں۔ اس لیے ایسے جانوروں کی مخصوص آوازوں کو ابلاغی چوکھٹے میں دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جانوروں کی اس نوع کی آوازوں پر شدید اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ ابلاغی قدر شعور اور ارادہ کی مرہون منّت ہوتی ہے۔ حیوانی آوازیں محض اظہاری کہی جاسکتی ہیں ان میں ابلاغ کے بجائے ردِّعمل کارفرما ہوتا ہے۔ زبان صرف انسان کا خاصّہ ہے۔ اس کا اطلاق تمام مخلوقات کی آوازوں پر نہیں بلکہ صرف ناطقۂ انسانی پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی تعریف کرتے ہوئے آوازوں کی تعمیم کے بجائے ناطقۂ انسانی کی تخصیص ضروری ہے۔

(۳) انسان کے منہ سے نکلی ہوئی خودساختہ آوازوں سے ہزاروں الفاظ اور علامتیں بنائی گئی ہیں۔ مزید یہ کہ زبان انسان کو ورثے میں نہیں ملی ہے بلکہ یہ اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انسان کی اپنی ضرورتیں اسے قوت گویائی سے کام لینا سکھادیتی ہیں۔ انسان بہ حیثیت مجموعی نہ صرف مختلف کیفیات و خیالات کا مجموعہ ہے، بلکہ اس کے اندر اظہار کے وہ تمام ذرائع موجود ہیں جسے صرف جلا بخشنا اس کا کام ہے۔ زبان کا سیکھنا یا اس سے کام لینا اسی نوع کی کوشش ہے۔ اس لیے زبان ایک اکتسابی عمل کہلاتی ہے۔ بقول خلیل صدیقی:

> ''انسان نے اپنی طویل تاریخ میں جو اکتسابات کئے ہیں، ان میں انتہائی بیش بہا ''زبان'' ہے۔ انسان کا سب سے زیادہ قابل تعریف کارنامہ ''زبان'' ہی ہے۔ زبان زندگی کے لیے ناگزیر تو نہیں لیکن انسان سے اس کی وابستگی اتنی زیادہ ہو چکی ہے اور وہ انفرادی اور سماجی زندگی کی ایسی ضرورت بن چکی ہے کہ اس کے بغیر انسان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا دوسری مخلوقات سے ممیّز کرنے کے لیے انسان کو حیوان ناطق بھی کہا جاتا ہے''۔ [۱۷]

---

[۱۷] زبان کیا ہے؟: خلیل صدیقی، ص۔ ۹

انسانی اکتسابات کا یہ سب سے عظیم کارنامہ ہے۔ زبان مفروضہ صوتی علامات اور الفاظ کا مجموعہ ہے۔ الفاظ کی تشکیل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ جن اشیاء کے لیے وضع کیے جاتے ہیں ان کا عکس ذہنوں میں محفوظ ہو جائے۔ ''الفاظ انسان کے دماغ میں مختلف چیزوں کی تصویریں پیش کرنے کے ذرائع ہیں ان کے کثرت استعمال سے یہ تصویریں تحت الشعور میں چلی جاتی ہیں اور دماغ کو بروقت تصویر کشی نہیں کرنی پڑتی''۔[۱۸] الفاظ اور علامتوں پر ہی اشخاص کے مابین گفتگو کا انحصار اور خیالات کی ترجمانی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس خیال کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی بیان کیا سکتا ہے کہ ''وہ ملفوظ آواز جو کسی خاص تصور کو پیش کرے لفظ ہے''۔[۱۹] کسی بھی زبان میں الفاظ اور علامتوں کا ذخیرہ خود ساختہ اور اختیاری ہوتا ہے۔ اس لیے زبان کو الفاظ اور علامتوں کا اختیاری اور خود ساختہ طریقۂ کار یا نظام کہا گیا ہے۔ زبان کے اختیاری (Arbitrary) ہونے کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ اور ان کے معانی اور خیال کے مابین کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کسی تجربہ، مشاہدہ موضوع یا حقیقت کے بیان اور ابلاغ و ترسیل کے لیے وضع کئے جاتے ہیں۔ ماہر لسانیات نے لفظوں یا علامتوں کے وضع کرنے کے دو طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ بقول زور الفاظ کی تشکیل عموماً دو طرح سے عمل میں آتی ہے۔ اس میں کچھ عوام کا حصّہ ہوتا ہے اور باقی عالموں اور انشا پردازوں کا۔ پہلی صورت ایسی علامتوں اور الفاظ کی ہے جن کے خیال اور اس کی خارجی صورت میں مشابہت ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی۔ یعنی اگر یہ مان لیا جائے کہ الفاظ اشیاء کی ملفوظی تصویریں ہیں تو فی الحقیقت اس خیال کی تائید سے زیادہ تردید ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ماہرین کا ماننا یہ بھی ہے کہ کچھ نظریات ایسے ہیں جن کے مطابق مظاہر قدرت اور انسانی مصنوعات کی متعدد قسم کی گونج یا جھنکار سے متاثر ہو کر الفاظ یا علامتیں وضع کی گئی ہیں۔ یا پھر مختلف قسم کے جذبوں سے سرشار ہو کر انسان جو آوازیں نکالتا ہے اس سے کچھ الفاظ یا علامتیں گڑھ لی گئی ہیں۔ لیکن کسی بھی زبان کے الفاظ کے ذخیرہ میں ایسے الفاظ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی شئے یا خیال کے لئے کوئی لفظ یا علامت متفقہ طور پر متعین

---

[۱۸] فن تحریر کی تاریخ : محمد اسحق صدیقی، ص۔ ۲۶

[۱۹] ہند آریائی اور اردو: حمید الدین قادری شرفی، ص۔ ۴۹

کر لی گئی ہو۔اس میں خیال اور اشیا کے مابین کوئی تعلق ہو یہ ضروری نہیں ۔ بلکہ لوگوں نے اپنے ذہنوں میں اس کے مروجہ معنی محفوظ کر لئے ہوں اور حسب ضرورت اس سے کام لیتے ہوں۔فریقین پر اس کا تصور واضح ہوتا ہے۔ایسے الفاظ یا ان علامتوں کا استعمال صرف انہیں معنوں میں ہوتا ہے جن کے لئے وہ وضع کیے گئے ہیں۔ان میں بہ آسانی تغیر وتبدل ممکن نہیں۔زبان میں الفاظ یا علامتوں کے وضع کرنے کا ٹھیک وہی تصور ہے جس طرح کہ اس بات کی کوئی وجہ بیان نہیں کی جاسکتی کہ ایک خاتون کے لئے اردو میں عورت، فارسی میں زن اور ہندی میں استری کیوں کہا جاتا ہے۔اس طرح کے الفاظ کا استعمال خالصتاً اختیاری اور متفق علیہ ہوتا ہے۔اس کی دوسری مثال اس طرح پیش کی جاسکتی ہے کہ کسی آدمی کا نام زید، عمر، قمر وغیرہ کچھ بھی ہو ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس شخص اور ان ناموں میں نہ تو کوئی بالذات تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی اس نام کے رکھنے کا کوئی معقول جواز۔ بلکہ یہ سب رشتے قبول عام کی سند کے محتاج ہوتے ہیں۔ جب یہ سند مل جاتی ہے تو یہ رشتے مستحکم ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ معاشرہ جس میں وہ شخص رہتا ہے اس کے لئے اس نام کی بہت اہمیت ہوتی ہے اور وہ تاعمر اسی نام سے جانا جاتا ہے۔

(۴) زبان کو علامتی اظہار کا تسلیم شدہ نظام بھی کہتے ہیں۔جیسا کہ متعدد بار عرض کیا گیا کہ کسی شئے کے لئے کوئی لفظ یا علامت وضع کر لی جاتی ہے۔خواہ ان اشیاء کے خیال اور خارجی علامات میں بالذات کوئی رشتہ ہو یا نہیں۔مگر اس مخصوص زبان کے بولنے والے ان علامات، الفاظ اور ان کے معانی سے واقف ضرور ہوتے ہیں۔جس طرح آئین زبان کے تحت الفاظ اور علامتوں کو وضع کرنے کے لئے کچھ اصول مقرر ہیں اسی طرح آوازوں اور لفظوں کی ترتیب کے لئے کچھ قاعدے بھی مستعمل ہیں۔زبان کی تشکیل کے لئے ترتیب کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صوتی جس کی ترتیب سے الفاظ کی تشکیل ہوتی ہے اور دوسری نحوی جس سے جملے بنائے جاتے ہیں۔ اِس کے تحت آوازوں اور لفظوں کو اُس مخصوص زبان کے مسلمہ اصولوں اور قاعدوں کے تحت سجایا جاتا ہے۔تا کہ ان آوازوں کے مرکب سے بامعنٰی لفظ اور لفظوں کی ترکیب سے بامعنٰی جملے بنائے جاسکیں۔ان الفاظ اور جملوں کے معانی اور ترتیب سے اس معاشرے کا ہر فرد واقف ہوتا ہے۔ اور انہیں وہ اپنے خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بناتا ہے۔اس کے برعکس اگر انہیں

حروف اور لفظوں کی ترتیب بدل دی جائے تو ان سے ہم کوئی بامعنٰی لفظ یا جملہ نہیں بنا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان حروف ( آ+د+م+ی ) کی ترتیب سے ایک بامعنی لفظ ''آدمی'' بنتا ہے۔ حروف کی ترتیب کا یہ اصول تسلیم شدہ ہے۔ لیکن اگر یہی ترتیب بدل دی جائے مثلاً ( م+د+ا+ی ) تو اس سے نہ تو کوئی لفظ بنے گا اور نہ تو یہ زبان کا کوئی اصول ہے۔ الفاظ کی ترتیب کا قاعدہ بھی اسی اصول پر مبنی ہے۔ یعنی الفاظ کی مناسب اور موزوں ترتیب سے ہی بامعنٰی جملے کی تشکیل ممکن ہے اور ان جملوں کی مدد سے ہی ہم اپنا مافی الضمیر ادا کر سکتے ہیں۔ زبان سے متعلق ترتیب و تنظیم کا یہ سلسلہ آگے چل کر اس کے قواعد کے حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔

( ۵ ) زبان کی ایک اہم خصوصیت اس کے سماجی پہلو میں مضمر ہے۔ سماج اور زبان کا آپس میں اٹوٹ رشتہ ہے۔ ایک کے بغیر دوسرے کے وجود کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ مثلاً بچہ اپنے گرد و پیش کے ماحول اور معاشرے سے ہی زبان سیکھتا ہے۔ اور زبان بھی کسی معاشرے میں رہ کر ہی پروان چڑھتی ہے۔ انسان مدنی الطبع ہے۔ ماہرین بشریات کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ تنہا نہیں رہ سکتا۔ ابتدا میں وہ جذبات کی پوٹ رہا ہوگا اور بعد میں اس کے ذاتی تقاضوں نے اسے اظہارِ خیال پر مجبور کیا ہوگا۔ اس طرح انسان نے اپنے خیال کی ترسیل کے لئے موثر ذریعہ ڈھونڈ نکالا ہوگا۔ اس کے میل جول اور ترسیل خیالات نے سماج کی تشکیل کی ہوگی۔ اگر چہ اس سماج کی ابتدائی حالت کتنی ہی ابتر کیوں نہ رہی ہو۔ انسان کے سماجی کردار میں لسانی برتاؤ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ زبان کا سب سے اہم مقصد اور منصب سماجی ہے۔ سماجی رشتے اس کے ذریعے سے مستحکم ہوتے ہیں۔ بلکہ اسے سماجی عمل کہنا چاہیے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو دوسرے سماجی عوامل مثلاً مذہب، اخلاق، قانون، تعلیم و ثقافت وغیرہ کی تنظیم و استحکام کا ذریعہ بنتا ہے۔ ذہنی، تہذیبی اور اخلاقی و روحانی ورثے اسی کے مرہونِ منت ہیں۔ اس کے وسیلے سے انسان کی اجتماعی زندگی میں تنظیم اور نکھار پیدا ہوتا ہے۔ زبان ہمارے افکار کی شکل متعین کرتی ہے۔ انسانی فکر و فلسفہ، تہذیب و تمدن کی اساس کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کا ذریعہ عظیم ہے۔ ہمارے تمام شعبۂ علم خواہ سائنس و تکنالوجی ہوں یا مختلف علوم انسانی اسی کے

سہارے وجود میں آتے ہیں ۔سب کی ترقی وترسیل کا انحصار صرف زبان ہی پر ہے۔ یہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو باندھے رکھنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔اس سے مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اہمیت کا تعین سماجی حیثیت کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مذکورہ تعریفوں کے تجزیے اور مطالعے سے زبان کی اہمیت اور اس کی خصوصیت کے مختلف پہلوؤں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس مفصل گفتگو کی روشنی میں ہمیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ زبان ہماری انفرادی یا معاشرتی زندگی پر کس حد تک اثر انداز ہے۔زبان اپنی اہمیت اور گوناگوں خصوصیت کے باعث وسیع مطالعے کا تقاضہ کرتی ہے۔اسی وجہ سے علم اللسان ایک با قاعدہ شعبۂ علم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ زبان اور علم زبان پر ہماری مختلف جامعات میں کافی توجہ صرف کی جا رہی ہے۔اس سلسلے میں نہ صرف زبان سے متعلق معلوم افزا انکشافات ہو رہے ہیں بلکہ قوموں کی تاریخ اور ان کی تہذیب کے واضح خطوط بھی قایم کیے جا رہے ہیں ۔ بہر حال اہم سوال یہ ہے کہ جب ہم کسی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس دوران اس کی ابتدا، ارتقاء اور تاریخ سے متعلق چند سوالات ذہن میں منعکس ہوتے ہیں ۔مثلاً زبان کی ابتدا کیسے ہوئی؟ سب سے پہلے انسان نے کون سی زبان استعمال کی؟ پہلے پہل کئی زبانیں وجود پذیر ہوئیں یا صرف ایک جو دنیا کی باقی تمام زبانوں کی ماں کہی جا سکتی ہے؟ کیا زبانوں کو انسان کی ایجاد کہا جا سکتا ہے؟ یا یہ براہ راست ودیعت ایزدی ہے؟ متذکرہ سوالوں کے جواب کے سلسلے میں مناسب ہے کہ سب سے پہلے زبان کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق نظریات کی جانب رجوع کیا جائے۔

زبان کی ابتدا کے نظریے اور اس کا ارتقا :

دنیا کے بیشتر علوم وفنون کی ابتدا اور آغاز کا سہرا یونانیوں کے سر جاتا ہے۔انہوں نے زیادہ تر علوم وفنون پر پہلے پہل گفتگو کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی آرا پیش کی ۔ زبان اور علم زبان پر بھی ان کی کوششیں دیکھنے کو ملتی ہے۔افلاطون نے زبان کا فطری نظریہ پیش کیا تھا۔اس نے اپنے مکالموں کے مجموعے (Cratylus) میں لفظوں کے آغاز پر بحث کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اشیاء اور ان کے نام میں ایک فطری اور لازمی تعلق ہے ۔اس کا عقیدہ تھا کہ زبان فطری اور با قاعدہ عمل ہے اور کسی لفظ کے صحیح معنی اشیا

سے ہی ظاہر ہوتا ہیں۔[۲۰] زبان کی تعریف کے حوالے سے الفاظ کے وجود میں آنے کی طویل بحثیں گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں۔ یہاں پہلے ان نظریات کا اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے جو زبان کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق ہیں۔

زبان کی ابتدا سے متعلق نظریات کو ہم دو حصوں میں رکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔اس کا پہلا حصہ وہی ہے جس کی اصل الوہی یا الہامی قرار دی گئی ہے۔اس حصہ میں مذہبی نظریات کی کثرت ہے اور مختلف مذاہب میں زبان کی ابتدا سے متعلق زبان کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔اس کا دوسرا حصہ ماہر لسانیات کی آرا اور دلیلوں پر مبنی ہے جسے کسبی نظریہ کہا جاتا ہے۔ کسبی نظریات کے ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے گذشتہ صفحات میں ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض ماہرین کی آرا بیک وقت متذکرہ دونوں طرح کے نظریات کا آمیزہ بن کر سامنے آئی ہیں۔ بہر حال ان دونوں طرح کے نظریات کا خلاصہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔وہبی عقیدے کے مطابق زبان الہاماً پیدا کی گئی ہے۔ اس میں ارادے کو کوئی دخل نہیں ہے یہ براہ راست ودیعت ایزدی ہے۔[۲۱] یہ خصوصیت وقت پیدائش سے ہی انسانوں میں اسی طرح موجود ہے جس طرح آنکھوں کو دیکھنے، دماغ کو سوچنے اور دل کو دھڑکنے کی قوت عطا کی گئی ہے۔[۲۲]

☆ اسلامی عقیدے کی رو سے اللہ تعالٰی نے آدم وحوا کو دنیا میں بھیجنے کے بعد انہیں الہاماً اشیاء کے مختلف نام سکھائے۔مزید یہ کہ قرآن عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے اور کلام اللہ ہے۔اس لئے اسلامی عقیدے کی روشنی میں عربی زبان آسمانی اور فطری زبان قرار پائی۔[۲۳]

☆ ہندوؤں کے یہاں سنسکرت جو وید کی زبان ہے اور دیو بھاشا ہے جو آکاش وانی کے ذریعہ ویدرشیوں کو سکھائی گئی اسے دیو بانی یا دیو بھاشا بھی کہا گیا ہے۔[۲۴]

---

[۲۰] اردو لسانیات: گیان چند جین، ص۔۳۳، ۳۴،

[۲۱] بہار میں اردو زبان اور ادب کا ارتقاء: اختر اورینوی، ص۔۵

[۲۲] ہندوستانی لسانیات: سیّد محی الدین قادری زور، ص۔۲۸

[۲۳] اردو لسانیات: گیان چند جین، ص۔۴۶

[۲۴] ایضاً۔۴۷

☆ بودھوں کے نزدیک پالی دنیا کی قدیم ترین آسمانی زبان ہے جو ازل سے چلی آرہی ہے۔ یہ قدیم پراکرت نہ صرف انسانوں کی ابتدائی اور اصلی زبان ہے بلکہ دوسرے حیوانات کی بھی ہے۔[۲۵]

☆ انجیل کے مطابق ابتدائی زمانے میں انسانوں میں صرف عبرانی رائج تھی جو دنیا کی قدیم ترین زبان ہے اور ان کے لیے خدا کا عطیہ ہے۔[۲۶]

☆ جینی اردھ ماگدھی پراکرت کو انسان وحیوان کی ازلی زبان مانتے ہیں۔[۲۷]

اس گفتگو کا دوسرا پہلو کسبی نظریات پر مبنی ہے۔یعنی زبان انسان کی تہذیبی اور ذہنی نشو نما کے ساتھ اس کی اپنی بالا رادہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ابتدائی انسان نے حالات اور ضرورت کے ساتھ آوازوں کو اپنے جذبات کے ترسیل کے لیے منظّم کیا۔ زبان کی ابتدا اور ارتقا انسان کی تہذیبی تاریخ کے کسی بھی مرحلے میں ہوئی ہو لیکن اس کی کہانی زیادہ تر قیاس آرائیوں اور مفروضوں پر ہی مبنی ہے۔ اس لیے ایسے نظریات سے آگاہی حاصل کرنے اور کسی تشفی بخش نتیجے تک پہنچنے کے لئے ان قیاس آرائیوں پر انحصار کیے بغیر کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ لہٰذا انہیں قیاس آرائیوں پر مبنی دلائل کی بنا پر ماہرین لسانیات نے زبان کی ابتدا سے متعلق چند نظریات پیش کیے ہیں جن کا خلاصہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

باہمی اختلاط یا معاہدے کا نظریہ : بعض فلسفیوں نے زبان کو انسانوں کے باہمی اختلاط اور معاہدہ کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس نظریے کے حامیوں کے مطابق ابتدا میں انسان متفقہ طور پر اشیاء کے نام اور الفاظ وعلامت کے معانی متعین کر چکا ہوگا اور اسے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے استعمال کرتا ہو گا۔ اس طرح زبان وجود میں آئی ہوگی۔ ابتدا میں اس نظریہ کی تاویل ڈیموکریٹس (Demokrites) اور ارسطو نے پیش کی اور اٹھارہویں صدی میں روسو نے اس کی توسیع کی۔[۲۸] اس نظریہ پہ ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اشیاء کا نام متفقہ طور پر اسی وقت رکھا جا سکتا ہے جب تبادلۂ خیال کے لئے زبان پہلے سے موجود

---

[۲۵] اردو لسانیات: گیان چند جین، ص۔۴۷

[۲۶] ایضاً ص۔۴۸

[۲۷] ایضاً ص۔۴۸

[۲۸] ایضاً، ۴۹

ہو۔اس طرح یہ نظریہ زبان کی نشو ونما اوراس کے ارتقا کی تاویل کرسکتا ہے ابتدا کی نہیں۔

زبان کا اضطراری نظریہ : اس نظریہ کے مطابق ابتدائی انسان جذبات کی پوٹ تھا۔وہ اکثر کسی جذبہ سے سرشار ہوکر کچھ آوازیں نکالتا تھا۔اضطراری کیفیت میں نکلی انہیں آوازوں سے قوت گویائی کی ابتدا ہوئی۔یعنی اس خیال کی رو سے الفاظ کے وجود میں آنے کی ابتدائی صورت اضطراری آوازیں بتائی گئیں ہیں۔لیکن اسے تسلیم کرنے میں قباحت یہ ہے کہ کسی بھی زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اوران سے دوسرے الفاظ کا اشتقاق بھی نہیں ہوتا ہے۔اور نہ ہی سابقہ یا لاحقہ کی مدد سے کوئی ترکیبی لفظ بنایا جاسکتا ہے۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ محنت کے وقت انسان کے حلق سے نکلی آوازوں سے زبان نے ارتقاء پایا ہے۔اس نظریہ کے بانی نوائر ہیں۔[۲۹] ان کے مطابق انسان جب محنت کرتا ہے تو اس کی سانسیں تیز ہوجاتی ہیں اور یہ سانسیں چند مخصوص آوازوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔انہیں آوازوں سے زبان کی ابتدا ہوئی ہے۔

ماہر زبان ریویز (G. Reversz) نے زبان کا ارتباطی نظریہ پیش کیا ہے۔اسے Contact Theory بھی کہتے ہیں۔[۳۰] جیسا کے اس نام سے ہی ظاہر ہے کہ انسان کے آپسی ربط وضبط کے نتیجے میں زبان وجود میں آئی ہے۔وہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے۔وہ تنہائی سے دور بھاگتا ہے۔ابتدا میں اس نے تنہائی سے بچنے کے لئے چھوٹے چھوٹے گروہ اور جتھے میں رہنا شروع کیا ہوگا۔اس گروہ میں اسے اپنے جذبات کی اظہار کی ضرورت پیش آئی ہوگی اوراس کے لئے اس نے لمس اور آوازوں کا سہارا لیا ہوگا۔ آہستہ آہستہ یہ محدود ذرائع ذہنی نشو ونما کے ساتھ ترقی کرتے گئے ہوں گے۔اس طرح ترسیلی آوازوں کے علاوہ فجائی اور اطلاعی آوازیں بھی وجود میں آئی ہوں گی۔پھر ان آوازوں نے فقروں اور جملوں کی شکل اختیار کرلی ہوگی۔

ڈنمارک کے ماہر لسانیات یاسپرسن (Otto Jesperson) نے فطری آوازوں کی نقالی کو زبان کا سر

---

[۲۹] بہ حوالۂ لسانی مطالعے: گیان چند جین، ص۔۵۲،

[۳۰] ایضاً ص۔۵۵،

چشمہ قرار دیا ہے۔ [۳۱] اس کے مطابق ابتدائی وحشی انسانوں کی ضرورتیں بہت کم تھیں۔ وہ اپنی بنیادی ضرورتوں کی تحصیل کے بعد زیادہ تر وقت ناچ، گانے اور عیش و مستی میں صرف کرتا تھا۔ وہ مختلف جذبوں سے ہمکنار ہو کر کچھ بے معنی فقرے یعنی مبہم سی آوازیں نکالتا ہوگا۔ ہماری گفتگو میں آوازیں ہی ترسیل خیالات کا اہم ذریعہ ہیں اس لیے اس نے (یاسپرس) یہ تسلیم کر لیا کہ زبانوں کے آغاز کا سراغ ایسی ہی بے ساختہ آوازوں میں ہی ڈھونڈنا چاہیے۔ ابتدا میں جوں جوں بول چال کی علامتی صورتیں ابھرتی گئیں ہوں گی انسان نے ان بے معنی فقروں کے کچھ معنی متعین کر لئے ہوں گے۔ اس طرح ابتدائی زبان میں پہلے طویل فقرے وجود میں آئے ہوں گے۔ پھر بعد میں الفاظ وضع کئے گئے ہوں گے۔

ہندوستانی ماہر لسانیات تاراپوروالے کا ماننا ہے کہ جس طرح بچہ زبان سیکھنے کے عمل میں کئی مراحل سے گذر کر اس پر دسترس حاصل کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ابتدائی انسان نے زبان کے اکتساب اور اس کو ترقی بخشنے میں مختلف مراحل طے کیے۔ انہوں نے اس سلسلے میں زبان سیکھنے اور بولنے کے عمل سے لے کر اس کی قواعد کی تکمیل تک چار منازل کا ذکر کیا ہے۔ [۳۲]

۱۔ پہلی منزل میں بچہ غوں غاں جیسی آوازیں نکالتا ہے۔ پھر اس کا شعور جیسے جیسے بالیدہ ہوتا ہے تو وہ ادھورے لفظوں کا استعمال کرنے لگتا ہے۔

۲۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے خیال کی ادئیگی کے لئے بے ترتیب الفاظ اور جملے بھی استعمال کرتا ہے۔

۳۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ اپنے معاشرے کی زبان اور اس کی پیچ و خم سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔

۴۔ چوتھی منزل میں زبان اور اس کی قواعد پر پوری طرح دسترس حاصل کر لیتا ہے۔

پہلی منزل میں وحشی انسان اپنی جبلی خواہشوں کی تکمیل کے لئے جانوروں جیسی آوازیں نکالتا ہوگا۔ دوسری منزل میں وہ اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مثلاً بھوک، پیاس، نیند وغیرہ کے لئے کئی مخصوص آوازوں کا استعمال کرتا ہوگا۔ تیسری منزل میں مادی اشیاء اور ابتدائی تصورات کے لئے الفاظ وضع کئے

---

[۳۱] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ: سیّد احتشام حسین، ص۔ ۱۷

[۳۲] لسانی مطالعے: گیان چند جین، ص۔ ۵۲

ہوں گے۔ چوتھی اور آخری منزل میں زبان مکمل صورت اختیار کر گئی ہوگی۔ لیکن تاراپوروالے کے نظریہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ بچہ اپنے ماحول سے زبان سیکھتا ہے۔ اسے کوئی نئی زبان وضع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اس کا ذہن پہلے ہی سے کسی مخصوص ماحول کی زبان سے واقف ہوتا ہے محض اسے بولنے کی استعداد بہم پہنچانی ہوتی ہے۔ جب کہ ابتدائی انسان کے زبان کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس کے سامنے نہ تو کوئی زبان موجود تھی اور نہ ہی کوئی منظّم معاشرہ ہی تھا۔

مشہور ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹر جی کے نظریہ کا ذکر بھی بہت اہم ہے۔ انہوں نے اپنے نظریہ کی بنیاد ان الفاظ پر رکھی ہے کہ 'Language is vocal reaction to natural and physical condition" یعنی زبان طبیعی حالات کا صوتی ردِعمل ہے۔ ۳۳؎ ان کے خیال میں ابتدا میں انسانوں نے اپنے مختلف جذبات اور ضرورتوں کے اظہار کے لئے کچھ آوازوں کا استعمال کیا ہوگا۔ بعد کو مشاہدے کی بنیاد پر انہیں آوازوں کی مدد سے الفاظ وضع کئے گئے ہوں گے۔ مزید اس کی ذہنی نشو ونماء اور تجربات کی بنا پر ان میں وسعت آئی ہوگی۔ اس طرح زبان کی ارتقائی منازل طے کرنے میں قریب ایک لاکھ سال کا عرصہ لگا ہوگا اور اسی درمیان انسان معاشرے میں منظّم ہوگیا ہوگا۔

اس سلسلے میں احتشام حسین کا خیال ہے کہ:

> ''زبان انسانوں نے پیدا کی اور گو اس میں ابتداءً قصد اور ارادے کو بہت زیادہ دخل نہیں تھا لیکن انسان کی سماجی ضروریات نے اسے اظہار خیال پر مجبور کیا اور اس کی ترقی یافتہ جسمانی اور دماغی ساخت نے اسے اظہار خیال کے وہ ذرائع دیے جن تک جانوروں کی رسائی نہ تھی''۔ ۳۴؎

مذکورہ بالا نظریات کے علاوہ چند اور کا ذکر ملتا ہے مثلاً انسانوں نے حیوانوں کی آوازوں سے متاثر

---

۳۳؎ لسانی مطالعے : گیان چند، ص۔ ۵۵

۳۴؎ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ: سیّد احتشام حسین، ص۔ ۱۷

ہوکر آوازیں نکالنی شروع کی ہوں گی جس سے زبان کی ابتدا ہوئی ہے۔اشیاء کی جھنکار سے متاثر ہوکر یعنی مصنوعات کی متعدد قسم کی گونج جیسے کھٹ کھٹ ،ٹن ٹن وغیرہ آوازوں کی نقل سے زبان وجود میں آئی۔ بعد میں انہیں کی مدد سے الفاظ وضع کیے ہوں گے۔زبان کی ابتدا سے متعلق یہ ایسے پھس پھسے نظریات ہیں جن کا ذکر محض رسمی طور پر کیا جا سکتا ہے ایسے نظریات زیادہ تر اعتراضات کا نشانہ بنے ہیں۔

ماہرین کے ان مختلف نظریات سے آگہی حاصل کرنے کے بعد کوئی نتیجہ اخذ کرنا بڑا ہی دشوار مرحلہ ہے۔ہم ان میں سے مکمل طور پر کسی ایک سے بھی مطمئن نہیں ہو سکتے ہیں۔لیکن ان نظریات میں پیش کی گئیں توجیہات اور زبان کی ابتدا سے متعلق پیش کردہ جواز کے علاوہ اس کے آغاز کی کوئی اور صورت بھی نظر نہیں آتی ہے۔ہمیں تسلیم ہے کہ مذکورہ بالا تمام گفتگو کا انحصار محض قیاس آرائیوں پر ہے۔ایسے میں ہمیں یہ بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ حقیقت انہیں نظریات میں کہیں پوشیدہ ہے۔ بحثیت مجموعی مذکورہ بالا خیالات کو مدنگاہ رکھتے ہوئے ان کی روشنی میں بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان بنی بنائی شکل میں انسان کو نہیں ملی ہے۔ بلکہ وہ اس کی باالارادہ کوششوں کا نتیجہ بن کر سامنے آئی ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جذبات کی کشمکش میں قدرت نے انسان کے ذہن کو ایسی نشو ونما بخشی ہے کہ اس نے آوازوں کو اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہوگا۔اس کی ذہنی استعداد اور جسمانی اعضا خیال کی عکاسی اور مادی اشیاء کی تسخیر میں مدد بہم پہنچاتے رہے ہیں۔ابتدائی انسان گزرتے وقت کے ساتھ فطرت کے نئے عناصر اور تجربات سے آشنا ہوتا رہا۔رفتہ رفتہ اس کے سامنے آوازوں سے لفظوں کی تشکیل کرنے کا مرحلہ پیش آیا اور پھر لفظوں سے فقرے اور فقروں سے جملے بنائے گئے ہوں گے۔اس طرح مکمل زبان کی ابتدا ہوئی ہوگی۔ یہ زبان ابتدائی انسان کی زندگی کو باندھے رکھنے کا موثر ذریعہ بنی ہوگی۔

زبان کا مطالعہ علم اللسان کے تحت کیا جاتا ہے۔ زبان کے با قاعدہ مطالعے کی ابتدا اٹھارہویں صدی میں سر ولیم جانس کے خطبہ سے ہوتی ہے۔ وہ یونانی ،سنسکرت ،قدیم فارسی ،لاطینی زبانوں کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچا کہ ان تمام زبانوں کا ماخذ ایک ہے۔اس نے اپنی اس دریافت کا با قاعدہ اعلان اپنے ایک تحقیقی مقالے میں ۲۷ ستمبر ۱۷۸۶ عیسوی میں رایل ایشیاٹک سوسایٹی ،کلکتہ کے

جلسہ میں پڑھ کر کیا۔۳۵؎ اس علمی انکشاف نے زبان سے دلچسپی رکھنے والے عالموں میں کھلبلی مچادی۔ اوراس طرح قدیم زبانوں کے مطالعے کا سلسلہ شروع ہوگیا جس کے نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے زبانوں کے متعلق حقائق اورمعلومات کا غیر معمولی ذخیرہ جمع ہوگیا۔دوسری جانب یورپ میں تقابلی لسانیات کی بنیاد پڑ چکی تھی۔اس کے تحت زبان کی داخلی بازتشکیل کے قاعدے وضع کئے گئے اوراس کے اصل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔

کسی بھی زبان کی اصل یااس کے ماخذ کی تلاش وجستجو خلا میں ممکن نہیں ہے بلکہ اس کا مطالعہ زبان کے وسیلے سے ہی کیا جاسکتا ہے۔زبانوں کی قدامت سے متعلق قیاس آرائی اور بات ہےاور دستاویز کے مطالعے سے کسی تشفی بخش نتیجے پر پہنچنا دوسری بات۔اگر زبان سے متعلق ابتدائی دستاویزات موجود ہوں تو ان کے غائر مطالعے سے زبان کے ماخذ یااس کی اصل کی نشاندہی ممکن ہوسکتی ہے۔لیکن ہمارے ماہرین کے نزدیک زبان کے مطالعے کی نوعیت اس سے بالکل مختلف اور دشوار کن رہی ہے۔ان کے پیش نظر ایسا کوئی مواد دستیاب نہیں ہے جس کے وسیلے سے اس قدیم زبان کا سراغ لگایا جاسکے جسے انسان نے پہلے پہل استعمال کیا ہوگا۔ہمارے یہاں کسی بھی زبان کی موجودہ تحریری دستاویز پانچ، چھ ہزار سال سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔۳۶؎ لیکن ایک خیال کے مطابق جومبنی بر قیاس محض ہے، کہ زبانوں کا استعمال لگ بھگ پندرہ بیس لاکھ سال سے ہورہا ہے۔ماہرین بشریات کی تحقیق کی رو سے اب تک کا جو قدیم انسانی ڈھانچہ ملا ہے ایک اندازے کے مطابق ۱۵ سے ۱۷ لاکھ سال پرانا ہوسکتا ہے۔۳۷؎ متذکرہ خیال کی روشنی میں اگر یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی جائے کہ ابتدائی انسان عرصۂ دراز تک کسی بھی طرح سے اپنے خیالات کی ترسیل سے نابلد تھا اوراس کے اندر اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں تھی۔کیوں کہ اس نے اپنی ابتدائی زندگی کا آغاز مکمل تاریکی اور گھور اندھیرے سے کیا ہوگا اور رفتہ رفتہ روشنی کی طرف بڑھا ہوگا، جیسے

---

۳۵؎ اردو کی لسانی تشکیل: مرزا خلیل احمد بیگ، ص۔۱۱

۳۶؎ جدید اردو لسانیات : امیر اللہ شاہین، ۔۲۷

۳۷؎ ایضاً ص۷۵

جیسے اس کی ضرورتیں بڑھتی گئی ہوگی جنہوں نے اسے اظہار خیال کے طرف توجہ دلائی۔ پھر بھی ابتدائی انسان کا زمانۂ تاریک اتنا طویل نہیں ہوسکتا جہاں پہنچ کر اس نے زبان کو باقاعدہ اپنے خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بنایا ہوگا۔ گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ ایک عرصے تک اس زبان کو جو ابتدائی انسان استعمال کرتا تھا ضبط تحریر میں لانے کے قاعدے وضع نہیں کیے گیے ہوں گے تب بھی ہمارے پاس ایسا کوئی قدیم ترین تحریری نسخہ دستیاب نہیں ہے جس کے ذریعے سے ہم اس قدیم زبان (Proto-Language) کی نشاندہی کرسکیں۔ یعنی ابتدائی زبان کی قدامت سے متعلق قیاسات کی پوری عمارت صرف خلا میں ہی ہے۔ اس مفروضے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ کسی بھی زبان کا مطالعہ ہم اس کی موجودہ دستاویز کی روشنی میں ہی کرسکتے ہیں اور یہی حقیقت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس قدیم زبان کا وجود بھی ہوگا اور اس کی ہیئت موجودہ پانچ یا چھ ہزار سال قدیم مواد کی اصل اور شکل سے مختلف ضرور رہی ہوگی۔

بحیثیت مجموعی انسان میں قوت گویائی سے کام لینے کی صلاحیت زبان سے متعلق دستیاب تحریری دستاویز (جس کی قدامت صرف پانچ سے چھ ہزار سال ہے) سے بہت قبل ہی ضرور پیدا ہو چکی تھی۔ اگر چہ ابتدائی ایام میں انسانوں کے مابین اظہار خیال کا وہ ذریعہ جسے آج زبان سے موسوم کیا جاتا ہے، انتہائی محدود اور مبہم کیوں نہ رہا ہو۔ اس وقت تک انسان کی جسمانی و دماغی ساخت اتنی ترقی یافتہ نہیں ہوگی جس کی مدد سے وہ ملفوظی علامتوں کے ذریعہ مادی اشیاء پر پوری طرح گرفت حاصل کرسکتا۔ تاہم کوئی تو اظہار کا ایسا وسیلہ ضرور رہا ہوگا جو اس کے باہمی اختلاط کا ذریعہ بنا ہوگا۔ موجودہ مواد اور تحقیق کی بنا پر زبان کی اس ابتدائی صورت کی نشاندہی کرنا جو واقعتاً موجودہ زبان کی اصل ہوگی قطعاً ممکن نہیں ہے۔ تحقیق کا انحصار سبب اور نتیجے کی منطق پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ قیاس آرائیوں پر۔ مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کے ہند یوروپی خاندان کی زبان کی تقریباً چھ ہزار سال کی تاریخ کے واضح خطوط دستیاب تحریری دستاویز کی روشنی میں ہی قایم کیے جاسکے ہیں۔ لیکن یہاں سوال زبان کے آغاز و ابتدا کا ہے اس سلسلے میں کسی تشفی بخش نتیجے تک پہنچنے کے لئے ان قیاس آرائیوں کو ہی بروئے کار لانا ہوگا۔

# زبان اور علم زبان کی اہمیت

کسی بھی شعبۂ علم میں دلچسپی رکھنے والے شخص یا طالب علم کے ذہن میں کم از کم تین طرح کے سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً وہ مخصوص علم کیا ہے؟ اس کا مقصد اور افادیت کیا ہے؟ اور اس کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟ زبان کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو بھی ہم ان سوالات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ ایسے سوالات جو کسی بھی موضوع سے متعلق مسائل کی طرف ہمارا ذہن مبذول کراتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جب ہم کسی زبان کو سیکھتے یا پڑھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کے ہم اس مخصوص زبان میں گفتگو کرنا یا اس میں دستیاب چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب یہ سوال پیدا ہو کہ، زبان کیا ہے؟ اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس کا مطالعہ ہمارے لئے کیوں کر ضروری ہے؟ تو ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کون سا علم ہے جس کے ذریعہ زبان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یا اس کا مطالعہ کس مخصوص طریقۂ کار سے کیا جائے۔ اس طرح کے سوالوں کا مطلب یہ ہوا کے ہم بالعموم کسی زبان کے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں پہلے اور دوسرے سوالوں کا جواب تلاش کرنے اور اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب یہاں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ زبان کا مطالعہ کیوں اور کس طرح کیا جائے۔ زبان سے متعلق ایسے سوالوں کا جواب علم اللسان میں ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ علم اللسان جسے لسانیات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت زبان کا باقاعدہ سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس سے متعلق مختلف مسائل پر گفتگو کی جاتی ہے۔ یعنی اس علم کے دائرۂ کار میں زبان کی تعریف، اہمیت، اصل، ابتدا، ارتقا اور اس کی زندگی جیسے موضوعات ہیں۔ اس کے تحت زبانوں کا عمومی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد کسی مخصوص زبان کے جاننے یا سیکھنے سے نہیں بلکہ اس مخصوص زبان کے متعلق جاننے سے ہے۔ ایسے سوالوں کا جواب یا ان کا حل تلاش کرنے کے لئے اس کی متعدد شاخیں ہو جاتی ہیں۔ چوں کہ ماہر زبان یہ چاہتا ہے کے زبان کا تجزیہ کرے اور اس کی اصل معلوم کرے۔ اسے الفاظ کے مختلف پہلوؤں اور تاریخی تبدیلیوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اس عمل میں کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ کئی زاویۂ نگاہ بناتا ہے جسے ہم لسانیات کی شاخوں سے موسوم کرتے ہیں۔ یہاں اس کی شاخوں کا ذکر مختصراً کیا جاتا ہے۔ تا کہ اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے اور یہ واضح ہو سکے کہ زبان کا مطالعہ کیسے اور کیوں کر ممکن ہے۔

تجزیاتی لسانیات :(Analytical Linguistuics)اسے توضیحی لسانیات (Discriptive Linguistics) بھی کہا جاتا ہے۔اس کے ذریعے سے زبان پر غور وخوض صوتی، صرفی ،نحوی اور معنوی کئی سطح پر کیا جاتا ہے ۔ یہ زبان کے مختلف اجزا قرار دیئے جا سکتے ہیں ۔صوتیات (Phonetics) کے تحت زبان کی صوتی نزاکتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔صرفی (Morphological) اعتبار سے لفظوں کی ساخت اوراس کی اشتقاقی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ نحویات اور معنیات میں الفاظ کے معانی اور جملوں کی بندشوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔مجموعی طور پر زبان کی تجزیاتی مطالعہ کا مقصد اس کی تاریخی تبدیلیوں کو روشنی میں لانا ہوتا ہے تا کہ یہ واضح ہو سکے کے زبان کا عہد بہ عہد ارتقا کس طرح ہوا ہے۔تاریخ کے کسی مخصوص عہد سے زبان کی ارتقا کی نشاندہی مذکورہ اجزا کو مدنظر رکھ کر ہی ممکن ہے۔

تاریخی لسانیات : (Historical Linguistics) کسی زبان کی خالصتاً تاریخی ارتقا کا مطالعہ تاریخی لسانیات کہلاتا ہے۔بقول سید محی الدین قادری زور''زمان ومکاں کے حالات کے مطابق زبان خود بخود بدلتی رہتی ہے اوراس تبدیلی کو ماہرین لسانیات زبان کا فطری ارتقا قرار دیتے ہیں''۔[۳۷] کسی بھی زبان میں صوتی تغیر یا تلفظ اور لب ولہجہ میں تبدیلی دو وجوہات کی بنا پر ممکن ہوسکتی ہے۔پہلی وجہ یہ ہے کہ ایک نسل دوسری نسل کے لئے جولسانی ورثہ چھوڑتی ہے اس کی اصل صورت برقرار نہیں رہ پاتی ہے۔کیوں کہ امتداد زمانہ اور کثرتِ استعمال سے لفظوں کے اصوات اور تلفظ میں فرق آ ہی جاتا ہے۔اس طرح کی تبدیلی اچانک رونما نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک سست رفتار لیکن فطری عمل ہوتا ہے۔جسے بعد کی نسل ہی محسوس کر پاتی ہے۔اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جغرافیائی حدود سے باہر کی زبانوں کا اثر ان کے باہمی اختلاط سے ایک دوسرے پر ضرور پڑتا ہے۔اس طرح ان دونوں صورتوں کا اثر وقت کے کسی مخصوص نقطہ میں ہو رہا ہوتا ہے۔یہی سلسلہ بعد میں بھی برقرار رہتا ہے۔اس سے زبان میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔یہی عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور زبان اپنی اصل صورت کھو بیٹھتی ہے۔اسے زبان کا بگڑنا کہا جاسکتا ہے۔لسانیات میں زبان کے بگڑنے کو بننے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔بگڑ کر بنی ہوئی نئی زبان یعنی پرانی زبان کی ترقی یافتہ شکل کو زبان کا ارتقا کہا جاتا ہے۔اس طرح زبان کی اصل، ابتدا، ارتقا اور مکمل حیات تاریخی لسانیات کے مطالعے کا موضوع بن جاتا ہے۔

تقابلی لسانیات:(Comparative Linguistics) جب ہم ایک ہی خاندان کی دو یا دو سے زیادہ زبانوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو اسے تقابلی لسانیات کہا جاتا ہے۔ایک ہی خاندان کی مختلف زبانوں میں لسانی مماثلتوں کی نشاندہی کر کے ان کا تعلق ظاہر کرنے کا کام تقابلی لسانیات کے ذیل میں آتا ہے۔جن زبانوں میں لسانی مماثلتیں پائی جاتی ہیں وہ ہم رشتہ زبانیں کہلاتی ہیں۔بہت ممکن ہے کی ایسی زبانوں کا ماخذ ایک ہو اور وہ کسی قدیم زبان سے نکلی ہوں۔باقی زبانیں جو کسی طرح لسانی مماثلتیں نہیں رکھتیں انہیں الگ کر کے زبانوں کی درجہ بندی عمل میں آتی ہے۔زبانوں کی گروہ بندی لسانیات کی تمام شاخوں کو مدنظر رکھ کر ہی ممکن ہے۔علم اللسان میں زبانوں کی گروہ بندی کے دو طریقے مستعمل ہیں۔ایک میں کسی زبان کا دوسری زبانوں سے رشتہ تلاش کیا جاتا ہے۔دوسرے کے تحت اس مخصوص زبان کی خصوصیت کا مطالعہ کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم کرسکیں کے اس زبان میں اشتقاقی خصوصیت موجود ہے یا نہیں۔ایسی زبانیں اپنی اصل صورت تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ان کے الفاظ میں سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے ان کے معنی میں تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ان کا اشتقاقی پہلو نمایاں کر کے انہیں ایک گروہ میں رکھ لیا جاتا ہے۔دوسری جماعت کی زبانیں یک لفظی ہوتی ہیں۔ان کا ہر لفظ آزاد ہوتا ہے۔ان سے نہ تو کسی لفظ کا اشتقاق ہوتا ہے اور نہ ہی ان میں لاحقوں اور سابقوں کی مدد سے معنی میں تغیر پیدا کیا جاسکتا ہے۔تقابلی لسانیات میں ان طریقۂ کار کا استعمال کر کے زبان کی گروہ بندی عمل میں آتی ہے۔یعنی یہ کہ کسی زبان کی تاریخ اور اصل کی نشاندہی کے لئے دستیاب مواد کے مطالعے کے ذریعہ پیچھے کی طرف لوٹ کر منزل بہ منزل اس کی تلاش کی جاتی ہے۔جہاں تک اس (زبان) کی تحریریں، کتبے دستیاب ہوں ان کے تاریخی مطالعے میں تقابلی طریقہ ساتھ دیتا ہے۔اس طرح زبان کی سابقہ صورت کی دریافت اور اس کی بازتشکیل کسی نسل کی مختلف زبانوں کے تقابلی مطالعے سے ہی ممکن ہے۔

ان کے علاوہ لسانیات کی ایک اور شاخ جسے نوعیاتی لسانیات(Typological Linguistics) کہتے ہیں۔اس کے تحت دو مختلف خاندانوں کی زبانوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔زبان کی تعریف اور اہمیت کو متعین کرنے کے لئے لسانیات کی شاخوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ان تمام شاخوں کا باہمی تعلق مسلم ہے۔زبان

کی تعریف، ماہیت، تشکیل، ارتقاء، زندگی اور وفات کا ذکر کیے بغیر اس کی تاریخ اور اہمیت کا تعین قدر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام صورتوں کا احاطہ لسانیات کی مذکورہ شاخوں سے استفادے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جب ہم کسی زبان کو پیش نظر رکھ کر لسانیات کی شاخوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس مخصوص زبان کی تاریخ متعین کرنے کی کوشش میں مصروف ہوتے ہیں۔ زبان کا تاریخی پس منظر اور اس کا تعین دراصل لسانیات کا اہم موضوع ہے۔ ان تمام مراحل سے گذرنے کا مقصد دراصل کسی زبان کی اصل کی دریافت اور اس کی تاریخ کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سید محی الدین قادری زور کی یہ باتیں تقریباً تمام مباحث کی تلخیص بن جاتی ہے:

> ''زبانوں کا تجزیہ، ان کی تاریخ، ان کی باہمی نقاط وارتباط، ان کی معنوی ساخت اور ان کی ظاہری تقسیم وگروہ بندی پر غور وخوض کرنا لسانیات کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ چونکہ زبان لفظوں سے بنتی ہے اس لئے لسانیاتیوں کا تعلق بالعموم لفظوں ہی سے ہوتا ہے۔ وہ ان پر اس لیے غور وخوض نہیں کرتے کہ ان کے معانی ومطالب دریافت کریں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تاریخ معلوم کریں''۔[۳۸]

●●●

---

۳۸۔ ہندوستانی لسانیات۔ سیّد محی الدین قادری زور، ص۔ ۱۷

# باب دوم

## لسانی گروہ بندی اور ہند آریائی کا ارتقاء

(اجمالی خاکہ)

دنیا کے مختلف خطوں میں متعدد قوم و نسل کے انسان نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ جس طرح اپنے رنگ، نسل، اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مختلف ہیں، اسی طرح ان کی زبانیں بھی ایک دوسرے سے جدا اور مختلف نظر آتی ہیں۔ ماہرین زبان کے ایک محتاط اندازے کے مطابق پوری دنیا میں قریب پانچ تا سات ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔[1] ان میں بعض زبانیں اپنی صوتی، صرفی، نحوی اور دیگر خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن ان میں کچھ ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان سب کو ایک ساتھ رکھ کر ان کا سائنٹفک مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے مطالعہ میں آسانی کے نقطۂ نظر سے پوری دنیا کی زبانوں کو ان کی صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات کے علاوہ ان کے تاریخی رابطوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے چند جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ''زبانوں کی گروہ بندی دو طرح سے عمل میں آتی ہے۔ پہلی قسم میں زبانوں کو ان کی لفظی اور صرفی خصوصیات کے لحاظ سے صرف دو بڑی جماعتوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ دوسری طرح کی گروہ بندی نسلی اور تاریخی تعلقات کی بنا پر عمل میں آتی ہے اور اس میں متعدد جماعتیں ہیں''۔[2] یعنی پہلی جماعت کی تقسیم لفظوں کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ دوسری جماعت کی درجہ بندی زبانوں کے تقابلی مطالعے اور تاریخی تعلقات کی بنا پر عمل میں آتی ہے۔ ان جماعتوں میں شامل زبانوں کے گروہ کو کسی خاندان السنہ (Language Family) سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔

متذکرہ اجمال کی تفصیل یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ زبانوں کی پہلی جماعت میں لفظوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے پہلے زمرے میں وہ یک لفظی زبانیں آتی ہیں جن کے الفاظ اپنی جگہ تنہا اور مکمل ہوتے ہیں۔ یہ اپنی شکلی تبدیلیوں سے اپنے مفہوم و معانی میں نہ تو کسی طرح کا تغیر و تبدل کرتے ہیں اور نہ ہی ان میں کوئی نیا معنی پیدا کرنے کے لئے سابقوں اور لاحقوں کا استعمال ہوتا ہے۔ ان الفاظ

---

[1] اردو کی لسانی تشکیل : مرزا خلیل احمد بیگ، ص۔۲۲۱،

[2] ہندوستانی لسانیات : سیّد محیالدین قادری زورؔ، ص۔۵۳

کے مادوں سے کوئی نیا لفظ بھی مشتق نہیں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں دراوڑی خاندان کی زبانیں اور چین میں بولی جانے والی زبانیں اس کی مثالیں ہیں۔اس جماعت کی دوسری قسم میں دنیا کی باقی زبانیں شامل ہیں۔ یہ وہ زبانیں ہیں جن کے الفاظ اپنی شکلیں اوران کے ساتھ مفہوم ومعنٰی بھی بدلتے ہیں۔یعنی اس کے بنیادی لفظ یا مادہ میں الفاظ یا اجزائے الفاظ جوڑ کر نئے الفاظ بنائے جاسکتے ہیں۔ان زبانوں کی اہم خصوصیت اشتقاقی ہے۔ان کے مادّں سے متعدد الفاظ مشتق ہوتے ہیں۔ یہ زبانوں کی نوعیاتی درجہ بندی (Typological Classification) ہے۔دنیا میں بولی جانے والی بیشتر ترقی یافتہ زبانیں مثلاً ہند یوروپی، سامی اور دیگر کئی خاندانوں کی زبانیں اشتقاقی خصوصیت کی حامل ہیں۔[۳۳]

اس تقسیم کی دوسری جماعت کی درجہ بندی زبانوں کے تاریخی تعلقات اوران کے تقابلی مطالعے کی بناپرعمل میں آتی ہے۔ان کا مطالعہ تاریخی اور تقابلی لسانیات کے تحت کیا جاتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بولی جانے والی بعض زبانیں باہم مماثلتیں رکھتی ہیں اور لسانی بنیادوں پر ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ایسی زبانوں کے الفاظ کی صوتی صورت، ان کی بناوٹ اور جملوں کی ساخت ان میں سے کچھ زبانوں کے آپسی تعلق کا پتہ دیتی ہیں۔انہیں مماثلتوں کی بنیاد پر یہ زبانیں ایک دوسرے کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ ہم رشتہ زبانیں کہلاتی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ لسانی مماثلتیں رکھنے والی ایسی زبانیں جو ایک دوسرے کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہیں ان کا ماخذ ایک ہو اور وہ کسی ایک زبان سے ارتقا پذیر ہوئی ہوں۔ایسی زبانوں کو کسی ایک گروہ یا خاندان میں شامل کیا جاتا ہے۔زبانوں کے اس گروہ کو لسانی خاندان یا خاندان السنہ (Language family) کہتے ہیں۔ایسے گروہوں سے زبانوں کی مذکورہ دوسری جماعت کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ زبانوں کی خاندانی درجہ بندی (Genealogical Classification) کا طریقہ ہے۔اس طرح مجموعی طور پر دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی جماعت بندی یا تقسیم کا مطلب اور مقصد نسلی یا نسبی درجہ بندی ہے۔لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ زبانوں کا تعلق کسی مخصوص قوم ونسل یا خاندان سے نہیں ہوتا ہے۔ کیوں کہ بعض لوگوں نے غلطی سے زبانوں کو نسلوں سے وابستہ کردیا ہے۔ ماہرین

---

[۳۳] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ: سید احتشام حسین، ص۔۲۵

لسانیات اسے صحیح تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ زبانوں کے خاندان کا مفروضہ عام طور پہ مستعمل خاندان کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔

زبانوں کے خاندان کا تصور اس امر سے واضح کیا جا سکتا ہے کہ کسی بڑے خطۂ ارض میں مختلف قوم و نسل کے لوگ مقیم ہوتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے درمیان اظہار خیال کا ذریعہ کوئی ایک زبان ہی ہوتی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس مخصوص خطّے میں رہ رہے لوگوں کا گروہ نقل مکانی (Migrate) کرکے دنیا کے دیگر خطوں اور مختلف سمتوں میں پھیل بھی جاتا ہے۔ ان گروہوں کی زبانیں جو کچھ تو نئی جگہ پہنچ کر اور زیادہ تر امتداد زمانہ کے باعث اپنی شکلیں تبدیل کرنے لگتی ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ (زبانیں) اپنی ارتقاء کی منزلیں طے کرتی ہوئی پھولتی پھلتی ہیں۔ ایک جانب زبانوں کی اس تبدیلی کو اس کے بگاڑ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو دوسری جانب یہی عمل نئی زبان کی نشو نما اور اس کے ارتقا کا سبب بھی ہے۔ اس طرح مختلف خطّوں میں مختلف زبانیں پھلتی پھولتی ہیں اور تمام گروہوں میں یہ سلسلہ یکساں طور پر جاری رہتا ہے۔ یعنی مذکورہ تمام عمل ایک نئی زبان کے وجود کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دوسری جانب بعد کی اِن زبانوں میں اُس قدیمی زبان کا اثر اور اشتراک جو غیر منقسم صورت میں مختلف گروہوں کی زبان تھی، برقرار رہتا ہے۔ اس وجہ سے ان متعدد پھیلی ہوئی زبانوں میں لسانی مماثلتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور ان مختلف زبانوں کا ماخذ وہی قدیمی زبان ہوتی ہے۔ زبانوں کی ایسی یکسانیت اور مماثلتیں ان کی آوازوں اور لفظوں کی ساخت کی بنیاد پر نشان زد کی جاتی ہیں۔

الفاظ کا بگاڑ امتداد زمانہ اور کثرت استعمال سے تلفظ اور معنی دونوں سطحوں پر ہوتا ہے۔ بسا اوقات ترک و اختیار کا عمل بھی شامل ہوتا ہے۔ اس بات کی تصدیق کسی بھی قدیم متن یا تحریروں کے مطالعہ سے جا سکتی ہے، کہ عہد حاضر کی زبانیں آج سے پانچ چھ سو سال پہلے کی زبانوں سے کس قدر مختلف اور کس حد تک مماثل نظر آتی ہیں۔ ہم شیکسپیئر کی تخلیقات کی زبان اور عہد حاضر کی انگریزی کا تقابل کریں یا اردو کی قدیم تحریروں کا آج کی موجودہ زبان سے، ان دونوں میں واضح تبدیلیوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ خواجہ مسعود سعد سلمان جنہیں ہندی کا پہلا شاعر مانا گیا ہے ۱۰۶۶ء کا تصنیف کیا ہوا ان کا کلام موجود ہے اسے

سامنے رکھیں یا ان کے علاوہ اس عہد کے ایک اور مصنف ہیم چندر (۱۱۷۲۔۱۰۸۸ء) کی ایک اہم تصنیف ''ہیم چندر شبدانوشاشن'' ہے اس کا مطالعہ کریں۔ کبیر داس کی زبان پر اگر چہ پورب کا گہرا رنگ غالب ہے اس کے باوجود اس عہد کی اردو سے حد درجہ مماثل ہے۔ حضرت گیسو دراز (وفات۔۱۴۲۱ء) حضرت امیر خسرو اور ملاّ وجہی کی تحریریں بھی دستیاب ہیں۔[۴] نمونے کے طور پہ یہاں ان حضرات کی تخلیقات کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں تا کہ اردو زبان کی عہد بہ عہد تبدیلیوں جائزہ لیا جاسکے۔[۵]

بھلاّ ہوا جو ماریا بہنی مہارا کنت　　　　لجّے جم تو واسیا ہو، جے بھگّا گھر وانت

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ　　　　منجہ چلتے جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

متذکرہ تخلیقات میں زبانوں کے ان اختلافات اور تبدیلیوں کو صوتی، صرفی، نحوی مختلف سطحوں پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بھلاّ، مہارا، لجّے، جم تو واسیا، بھگّا، وانت، ساتی تیرا چاؤ، منجہ، لیکھن، باؤ، ہمن، وغیرہ الفاظ آج صوتی اعتبار سے بھی نامانوس ہیں اور صرفی یعنی الفاظ کی سطح پر بھی متروک ہو چکے ہیں۔ شاعری کے علاہ اگر اس عہد کے نثر پاروں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کے ان کے قاعدے بھی بدل چکے ہیں۔ ابتدا میں ایسی تبدیلیاں نا قابل توجہ ہو سکتی ہیں لیکن زبانوں کے ارتقاء یا اس کی پیدائش میں انہیں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مذکورہ بالا مثالوں کے علاوہ آج سے ڈھائی ہزار سال قبل سنسکرت زبان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ۶۰۰ ق م کے آس پاس مذکورہ زبان میں واضح تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ کلاسیکل سنسکرت کے زمانۂ عروج میں مختلف فطری بولیاں مثلاً پالی، ماگدھی، اردھ ماگدھی، شورسینی وغیرہ کا چلن عام ہوا اور یہ اپنا حلقۂ اثر بڑھانے لگیں۔ نیتجتاً سنسکرت میں ہی تت سم یعنی سنسکرت کے خاص اور اصل الفاظ کم ہونے لگے اور ان کی جگہ تدبھو یعنی سنسکرت کے الفاظ سے بدل کر بنائے ہوئے الفاظ کا ذخیرہ بڑھنے لگا۔ اس نوع کی تبدیلی دنیا کی تمام زبانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ سنسکرت زبان کے ارتقا کے حوالے سے اس موضوع پہ گفتگو آیندہ صفحات میں کی جائے گی۔ بہر حال لسانیات کے ماہرین اسے اپ بھرنشوں

---

[۴] اردو ادب کی تنقیدی تاریخ : سیّد احتشام حسین، ص۔۱۴

[۵] مقدمہ تاریخ زبان اردو، مسعود حسین خاں، ص۔۷۳، ۸۰

کا عہد کہتے ہیں۔ ۶؎ زبانوں میں ایسی تبدیلیاں سیکڑوں سال پر محیط ہوتی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تاریخ میں بالعموم اور زبان کی تاریخ میں بالخصوص سو دو سو سال کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ زبانوں میں قوموں کے مقابلے تبدیلیوں کا عمل بہت ہی سست رفتار ہوتا ہے۔ اردو لسانیات سے متعلق تصانیف میں ایسی بحثوں پر مبنی بیشتر مثالیں موجود ہیں۔ محمود خاں شیرانی، سیّد محی الدین قادری زور، سنیتی کمار چٹر جی اور مسعود حسین خاں وغیرہ نے اپنی تصنیفات میں اس سلسلے کی طویل فہرستیں پیش کی ہیں۔ بہر حال یہاں ہمیں اس بات سے سروکار نہیں کہ اردو زبان میں کس طرح تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس نے کس طریقے سے اپنا روپ بدلا۔ بلکہ ہمیں بالعموم زبان کی بدلتی شکلیں اور ان کے ارتقاء کی داستان سے بھی غرض ہے۔ مثال کے طور پر آج یورپ اور ایشیا کی رائج زبانوں میں سے کئی سطح پر ہم ایسے ثبوت فراہم کر سکتے ہیں۔ جیسے پتر، پتا، پدر، فادر اور Peter یہ تمام الفاظ ایک ہی معنٰی میں دنیا کی مختلف زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور ان کی صوتی مشابہتیں کسی ایک ماخذ (زبانوں کے ہند یوروپی خاندان) سے ارتقا پذیر ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ ۷؎

مندرجہ بالا سطور میں زبانوں کے خاندان کا تصور، ان کی بدلتی شکلیں اور مطالعے کی مختلف جہتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان موضوعات پر بات آگے بڑھانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زبانوں کے خاندانوں کا تفصیلی جائزہ پیش کر دیا جائے تا کہ ان کی درجہ بندی اور درجہ بندی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ مختلف ماہرین لسانیات نے زبانوں کے خاندان کو مختلف طریقے سے پیش کیا ہے۔ لسانی تاریخ پر اردو میں چند کتابیں دستیاب ہیں ان میں لسانی گرہوں کا ذکر کچھ اس طرح ملتا ہے۔ مثلاً سید احتشام حسین ۸؎ اور سید محی الدین قادری زور نے ۹؎ دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کو آٹھ بڑے لسانی خاندانوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کے نام اس طرح بیان کئے ہیں:

---

۶؎ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ : سیّد احتشام حسین، ص۔۱۰

۷؎ ہسٹاریکل لنگوسٹکس این انٹروڈکشن : وی۔ پی۔ لیہمن، ص۔۱۷

۸؎ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ (مقدمہ) : سیّد احتشام حسین، ص۔۲۷

۹؎ ہندوستانی لسانیات : سیّد محی الدین قادری زور، ص۔۵۴

۱۔ سامی

۲۔ ہند یورپی

۳۔ افریقہ کی بانتو

۴۔ ہند چینی

۵۔ دراوڑ

۶۔ ملایائی

۷۔ منڈا

۸۔ امریکی

جب کہ جان بیمز نے یورپ اور ایشیا کی زبانوں کو تین بڑے خاندانِ السنہ میں تقسیم کیا ہے۔[۱۰] اس کے ذریعے کی گئی لسانی خاندانوں کی درجہ بندی اس طرح ہے۔

۱۔ ہند جرمانی

۲۔ سامی

۳۔ تورانی

ایک امریکی ماہرِ لسانیات ونفریڈ۔ پی۔ لیہمن (Winfred P. Lehmann) نے اپنی کتاب "Historical Linguistics : An Introduction" میں دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کی لسانی درجہ بندی نہایت واضح طور پر پیش کی ہے اور انہیں سات مخصوص لسانی خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ لیہمن نے ان خاندانوں کے نام اس طرح بیان کئے ہیں۔[۱۱]

۱۔ ہند یورپی (Indo-European)

۲۔ افریقی ایشیائی (Afro-Asiatic)

---

[۱۰] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ : سیّد احتشام حسین، (ترجمہ)، ص۔۷۷

[۱۱] ہسٹاریکل لنگوسٹکس: این انٹروڈکشن: ونفریڈ۔ پی۔ لیہمن، باب دوم، ص۔۱۷ تا ۵۰

۳۔ چینی تبّتی (Sino-Tibetan)

۴۔ الطائی (Altaic)

۵۔ دراویڈی (Dravadian)

۶۔ آسٹروایشیائی (Astro-Asiatic)

۷۔ فنواگرک (Finno-Ugric)

لیکن ایک اور مشہور ماہر لسانیات A.R.Lotto نے خاندان السنہ کی تفصیلات ذرا مختلف طریقہ سے بیان کی ہے۔ اس نے اپنی تصنیف (Historical Linguistics : An Introduction) میں پوری دنیا کی زبانوں کے خاندانوں کو چار جغرافیائی حصوں میں تقسیم کر کے چھوٹے بڑے ۲۳ خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔[۱۲] عام طور پہ ماہرین نے لسانی گروہوں کی درجہ بندی ان کے حلقۂ اثر کے مطابق ہی پیش کی ہے۔ اس لیے مذکورہ تمام طریقۂ کار کو مدنگاہ رکھتے ہوئے ان میں چھوٹے بڑے مخصوص خاندانوں کا ذکر قدرے وضاحت کے ساتھ ان کے جغرافیائی اعتبار سے پیش کیا جارہا ہے۔

☆ یورپ اور مشرق وسطی کے لسانی گروہ : Language Families of Europe and the Middle East

۱۔ ہندیورپی خاندان السنہ (Indo European Family)

زبانوں کا ہندیورپی خاندان دنیا کے بڑے خاندانوں میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ لسانی مطالعے میں اس خاندان کی بہت اہمیت ہے۔ اس کی زبانیں نہ صرف یورپ کے ملکوں، ایران اور ہندوستان میں بولی جاتی ہیں بلکہ عہد حاضر میں پوری دنیا میں اس کا حلقۂ اثر ہے۔ ہندوستان کے جنوبی علاقوں کو چھوڑ کر قریب پورے ملک میں اسی خاندان کی زبانیں اور بولیاں رائج ہیں۔ ہندوستان کی قومی زبان ہندی یا برّ صغیر میں وسیع پیمانے پر مستعمل اردو کا براہِ راست تعلق اسی خاندان سے ہے۔ اس ضمن میں ہندی یا اردو کا نام جب ایک ساتھ آتا ہے تو اس سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ رسم الخط اور ذخیرۂ الفاظ کے علاوہ یہ دونوں زبانیں اپنی اصل اور ساخت کے اعتبار سے ایک ہیں لیکن ان کا وجود مختلف ہے۔ ان میں اردو کا

---

[۱۲] ہسٹاریکل لنگوسٹکس: این انٹروڈکشن: آر۔ لوٹو، ص۔ ۴۷

ارتقا پہلے ہوا بعد میں ہندی کو شعوری طور پر جلا بخشنے کی کوشش کی گئی۔ اس لئے ہمارے مطالعے کے لئے ہند یوروپی خاندان اصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آیندہ صفحات میں اس خاندان کی اہمیت اور اس کی زبانوں پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

۲۔ سامی (Semitic) یا حامی وسامی (Hemito-Semitic)

ہند یوروپی خاندان کی زبانوں کے بعد سامی خاندان السنہ کی زبانیں ماہرین کے نزدیک سب سے زیادہ توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ یعنی یہ دوسرا بڑا خاندان ہے جس کا مطالعہ وسیع پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ A. R. Latto اور W.P.Lehmann ان دونوں نے سامی (Semitic) کو Hemito Semitic سے یاد کیا ہے۔ اس کے علاوہ Greenberg نے Afro-Asiatic کے نام سے اسے وسعت دی ہے۔[۱۳] اس خاندان کی زبانوں کا ذکر دو طرح سے ملتا ہے۔ اول حامی وسامی (Hemito-Semitic) کی حیثیت سے اس کی پانچ شاخیں ہیں جس میں (Semitic) بھی شامل ہے۔ (۱) باربری (Barber)، (۲) مصری (Egyptian)، (۳) چڈ (Chad)، (۴) کا کیشائی (Cushitic) اور ان کے علاوہ پانچویں شاخ (Semitic) کا ذکر آتا ہے۔ افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے بیشتر خطے میں لوگ سامی نسل کی زبانیں بولتے ہیں۔ بیشتر کتابوں میں صرف سامی کا ہی ذکر ملتا ہے کیوں کہ اس میں ایسی زبانیں مثلاً عبرانی اور عربی شامل ہیں جن کا حال کے ساتھ ماضی نہایت تابناک رہا ہے۔ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں نے اسے بہت اہم بنا دیا ہے۔ بہر حال اگر بالخصوص سامی (Semetic) خاندان کا ذکر کریں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی زبانیں تین مختلف شاخوں (۱) شمال مغربی (۲) شمال مشرقی اور (۳) جنوب مغربی میں بٹ جاتی ہیں۔ ان میں شمال مغربی کی ترقی یافتہ شکل ہیبرو (Hebrew)، شمال مشرقی کی اکاڈین اور جنوب مغربی کی ترقی یافتہ شکل عربی زبان ہے۔ عربی مشرقی وسطیٰ کے بیشتر ملکوں کی قومی اور سرکاری زبان ہے۔ باربری (Barber) زبان شمالی افریقہ اور سہارا ریگزار سے لگے تمام علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ کا کیشائی (Caushitic) زبانیں کسی حد تک مصر کے جنوب اور افریقہ میں بحر احمر کے سواحل اور اس سے جنوب کے علاقوں میں رائج ہیں۔ بوگو

---

[۱۳] اسٹڈیز آف افریکا لنگوسٹک کلاسیفیکیشن: گرین برگ، بہ حوالہ ہسٹاریکل لنگوسٹکس: این انٹروڈکشن: وی۔ پی۔ لیہمن، ص۔ ۱۴،

(Bogo) سومالی (Somali) اور گالا (Galla) زبان کا تعلق اسی شاخ سے ہے۔ چڈ (Chad) شاخ کی زبانیں چڈ جھیل کے مشرقی اور جنوبی علاقوں میں بولی جاتی ہیں اور مصری (Egyptian) کی زبانیں قدیم مصری اور کوپٹک ہیں جواب بھی کوپٹک چرچ میں عبادت کا ذریعہ ہے۔

۳۔ الطائی (Altaic)

اس خاندان کی زبانیں جنوب مشرقی یورپ اور اس سے متصل ایشیاء کوچک کے کچھ علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ اس کی تین اہم شاخیں (۱) ترکی (Turkish) (۲) منگولین (Mangolian) اور (۳) تنگز (Tunguz) ہیں۔ یہ شاخیں مزید کئی شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ ان کا حلقۂ اثر وسطی ایشیا، منگولیا اور چین کے علاقے ہیں۔

۴۔ سمیرین (Sumerian)

سامی خاندان السنہ کی زبانوں کے موجودہ حلقۂ اثر میں ایک اور علاحدہ زبان موجود تھی جس کا تعلق زبانوں کے سمیرین خاندان سے ہے۔ اکاڈین کے آمد سے چار ہزار سال قبل مسیح میسو پوٹامیا میں سمیرین کی تہذیب کا پتہ ملتا ہے۔ وہاں کے اس وقت کے خاندان السنہ کی زبان کے علاوہ ایک دیگر زبان رائج تھی۔ اس سے متعلق دستیاب دستاویز اور آثار قدیمہ موجودہ رکارڈوں میں سب سے زیادہ پرانے ہیں۔

۵۔ فنو اگرک (Fino-Ugric)

یورپ میں بولی جانے والی ایسی متعدد زبانیں موجود ہیں جن کا تعلق ہند یورپی خاندان سے نہیں ہے۔ یورپ کے گردونواح میں فنو اگراک خاندان کی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ اس خاندان کا علاقہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ اس کی اہم زبانیں ہنگرین (Hungarian)، فنش (Finnish) اور اسٹونین (Stonian) ہیں۔

☆ ایشیائی زبانوں کا خاندان (Language Families of Asia)

۶۔ چینی تبّتی (Sino-Tibetan)

مشرقی ایشیا میں زبانوں کا سب سے اہم خاندان ''چینی تبّتی'' خاندان ہے۔ تبّتی برمی اور چینی اس

خاندان کی دو اہم شاخیں ہیں۔اس کی پہلی شاخ تبتی برمی میں تبت اور برما کی زبانیں شامل ہیں اور چینی شاخ میں زیادہ تر چین کی زبانوں کا شمار ہوتا ہے۔یہ زبانیں ہانگ کانگ،تائیوان،تھائی لینڈ،ویت نام اور شنگھائی وغیرہ میں بولی جاتی ہیں اور انھیں قومی اور سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

۷۔ دراویڈی (Dravidian)

ہندوستان کی چار جنوبی ریاستوں میں اسی خاندان کی بولیاں عام طور سے بولی جاتی ہیں۔ دراویڈی خاندان کی موجودہ زبانیں تمل،تلگو،کنڑ،ملیالم بہت اہم ہیں اور تامل ناڈو،آندھرا پردیش،کرناٹک اور کیرل میں رائج ہیں۔یہاں ہند یورپی خاندان کی آمد سے قبل اسی خاندان کی بولیاں رائج تھیں۔ہند یورپی خاندان کے توسیع کے وقت اس خاندان کے لوگ جنوبی ہندوستان کی طرف کوچ کر گئے۔آج ہندوستان کی مادری زبانوں کی فہرست میں ان کا اہم مقام ہے اور ان میں ادب کا بھی وافر ذخیرہ موجود ہے۔

۸۔ مالے پولی نیشیائی (Maly-Polynesian)

ایشیا کے جنوب اور مشرقی حصے،مزید بحر ہند اور بحر الکاہل کے جزیروں میں بولی جانے والی زیادہ تر زبانوں کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔مالائی (Malayan) اور پولی نیشیائی (Ploynesian) اس کی دو شاخیں ہیں۔مالائی زبانیں جمہوریہ ماگاسی اور انڈونیشیا کی قومی وسرکاری زبانیں ہیں۔ان کے علاوہ بھاشا انڈونیشیا (Bhasha Indonesia) کا تعلق بھی اسی شاخ سے ہے۔ملیشیا،فلپین اور اس کے جزیروں میں بولی جانے والی جملہ زبانوں کا تعلق بھی اسی مالائی شاخ سے ہے۔اس خاندان کی دوسری شاخ پولی نیشین (Polynesian) کہلاتی ہے اس کی زبانیں بحر الکاہل کے جزیروں، نیوزی لینڈ اور فیجی وغیرہ میں بولی جاتی ہیں۔

☆ افریقی زبانوں کے خاندان (Language Families of Africa)

افریقہ کے علاقوں میں مالائی اور سامی نسل کے علاوہ کچھ اور مختلف زبانوں اور ان کے خاندانوں کا ذکر ملتا ہے۔ان میں دو خاندان نائجیر یائی کونگو (Niger-Congo) اور خوئسان (Khoisan) زیادہ اہم

ہیں۔ نائیجر کونگو خاندان السنہ کی چھ شاخیں ہیں اور اس کی زبانیں سینیگل (Senegal) گھانا، شمالی اور جنوبی نائجیریا وغیرہ میں بولی جاتی ہیں۔ خوئسیان (khoisan) کی زبانوں میں افریقہ کی بانٹو کا شمار ہوتا ہے۔ یہ زبانیں افریقہ کے جنوبی علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔

☆ امریکی زبانوں کے خاندان (language Families of America)

عہد حاضر میں امریکی ممالک میں جن زبانوں کو زیادہ تر اہمیت حاصل ہے ان کا تعلق زبانوں کے ہند یورپی خاندان سے ہے۔ اس خاندان کی زبانیں انگریزی، فرنچ، اسپینش، جرمن وغیرہ کا چلن قریب پوری دنیا میں عام ہوتا جا رہا ہے اور بالخصوص انگریزی نے تو عالمی فتح حاصل کر لی ہے۔ امریکی ممالک میں بھی زیادہ تر ہند یورپی خاندان کی زبان انگریزی کا چلن ہے۔ اگر چہ ان زبانوں کو امریکی ممالک میں پہنچے ہوئے پانچ، چھ سو سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا ہے۔ لیکن بالخصوص امریکہ کی معیاری و آفیشیل زبان انگریزی ہی ہے۔ ہاں ان زبانوں کے پہنچنے سے قبل اس خطے میں جو زبانیں بولی جاتی تھیں انہیں تقریباً ۵۵ چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔[۱۴] ان کی زبانوں کے خاندان کی تاریخ میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

بحیثیت مجموعی یہاں چند باتیں قابل ذکر ہیں کہ A.R. Lotto اور W.P.Lehmann جیسے ماہرین نے لسانی گروہوں کی وضاحت میں تفصیل سے کام لیا ہے۔ ان حضرات نے زبانوں کی جغرافیائی حدود کی نشان دہی واضح انداز میں کی ہے جس سے موضوع کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ یہاں زبانوں کے خاندان میں صرف انہیں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی اہمیت مسلم ہے۔ عام طور پر ماہرین نے صرف آٹھ مخصوص خاندان السنہ کے نام پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن جیسا کے گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا کہ آر۔ لوٹو۔ نے چھوٹے بڑے زبان کے ۲۳ خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے مذکورہ تمام مواد کو پیش نظر رکھتے ہوئے آٹھ خاندانوں کے علاوہ مزید کئی قابل لحاظ خاندانوں کو شامل کر کے اس کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں ایسے لسانی گروہ بھی شامل ہیں جن کا زیادہ تر ماہرین زبان ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔

---

[۱۴] ہسٹاریکل لنگوسٹکس: آر۔ لوٹو، ص۔ ۴۵

مذکورہ بالا تفصیلات میں بیشتر ماہرین سے کسب فیض کیا گیا ہے تا کہ زبانوں کی خاندانی تقسیم کا واضح تصور قائم ہو سکے۔

گذشتہ صفحات میں دنیا کے مخصوص خاندان السنہ کا ذکر مجموعی طور پر پیش کیا گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام خاندانوں میں زبانوں کا ہند یورپی خاندان کئی حیثیتوں سے اہم اور بڑا ہے۔ اپنی گونا گوں خصوصیات کی بنا پر اس خاندان کا اپنا مخصوص مقام ہے۔ اس سے متعلقہ زبانوں اور بولیوں کا حلقہ اثر نہایت وسیع ہے۔ اس خاندان کی زبانیں نہ صرف یورپ و ایشیا کے بڑے خطۂ ارض میں بولی جاتی ہیں بلکہ اس میں شامل چند زبانوں کا اقتدار پوری دنیا پر ہے۔ ہندوستان کی قومی زبان اور اس کے وسیع علاقے میں بولی جانے والی بے شمار بولیوں ماسوا چند دراوڑی خاندان کی بولیوں کہ، مثلاً تمل، تلگو، کنڑ، ملیالم کے، بیشتر کا براہ راست تعلق ہند یورپی خاندان سے ہی ہے۔ اس کے علاوہ اس خاندان کی اہمیت کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس خاندان میں ایسی زبانیں شامل ہیں جو اپنے ادبی اور علمی ذخیروں کے لحاظ سے دنیا کی سب سے اعلیٰ زبانیں کہلاتی ہیں۔ دوم یہ کہ زبانوں کی باز تشکیل اور ان کے اصل تک رسائی حاصل کرنے کی ابتدا اسی خاندان کی زبانوں کے مطالعے سے ہوتی ہے۔ اگر اس واقعہ کو یاد کریں کہ سر ولیم جونس زبانوں کے عمیق مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ یورپ و ایشیا کی زبانیں مثلاً سنسکرت، قدیم فارسی، یونانی، لاطینی، کلٹک، اور جرمانک کا ماخذ ایک ہے۔ اور یہ سبھی کسی ایک ہی قدیم زبان سے ارتقا پذیر ہوئی ہیں۔ انہوں نے اپنے اس مشاہدے کو باقاعدہ طور پر ۲۷ ستمبر ۱۷۸۶ء کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جلسے میں ایک مقالے کی صورت میں پیش کیا تھا۔ ان زبانوں کے مطالعے سے جہاں ایک طرف یورپ و ایشیاء کی زبانوں کے ماخذ کا انکشاف ہوا۔ وہیں دوسری جانب تاریخی اور تقابلی لسانیات کے اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملی۔ انہیں اصولوں کا اطلاق دنیا کے مختلف خاندان کی زبانوں کی عقدہ کشائی کے لئے کیا جاتا ہے۔ یہ ایک اچھی شروعات تھی اس سے لسانیاتی مطالعے کی راہیں اور زیادہ ہموار ہوئیں۔ اس لئے یہ خاندان اپنی گونا گوں خصوصیات اور اس موضوع و اردو زبان سے براہ راست تعلق رکھنے کے باعث تفصیلی مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس خاندان کی حسب ذیل گیارہ شاخیں ہیں۔[۱۵]

---

۱۵۔ اردو کی لسانی تشکیل: ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، ص۔۲۲۴،

۱۔ ہندآریائی یا انڈک Indo-Iranian

۲۔ یونانی Greek

۳۔ جرمانی Germanic

۴۔ البانی (الغامی) Albanic

۵۔ آرمینیائی Armenian

۶۔ بالٹک Baltic

۷۔ سلاوی Slavic

۸۔ لاطینی Italic

۹۔ کلٹک Celtic

۱۰۔ اناطولیائی Anatolian اسے (ہٹائٹ) بھی کہتے ہیں۔

۱۱۔ تخاری Tocharian

مندرجہ بالا شاخیں ہندیورپی خاندان کی گیارہ ذیلی خاندانیں کہی جاسکتی ہیں۔اس قوم نے اپنے ابتدائی مسکن سے نقل مکانی کر کے یورپ و ایشیا کے مختلف خطوں میں پھیل کر اپنا الگ وجود اور شناخت قائم کیا۔ وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے ہندیورپی خاندان کی یہ تمام ذیلی خاندانیں مزید مختلف شاخوں میں تقسیم ہوجاتی ہیں۔اوران کی ایک شاخ سے کئی کئی زبانیں وجود پذیر ہوتی ہیں۔اس طرح دنیا کے نقشے میں ہندیورپی خاندان کی زبانوں نے نہ صرف یورپ و ایشیا کے بڑے خطہ ارض کو اپنے حلقۂ اثر میں شامل کرلیا ہے بلکہ دنیا کے بیشتر علاقوں میں اپنا سکہ جما لیا ہے۔ دنیا کے دیگر خاندانوں میں اس خاندان کے مقام کا تعین کرتے ہوئے سنیتی کمار چٹرجی لکھتے ہیں:

> ''یورپ و ایشیا،افریقہ،آسٹریلیا،اوشینیا، اور امریکہ میں جن لسانی خاندانوں کی زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں،ان میں ہندیورپی زیادہ اہم ہے۔کرۂ ارض پر لوگوں کی سب سے زیادہ تعداد اس کے حلقہ اثر میں

ہے۔ اس میں قدیم و جدید،بعض ایسی بااثر زبانیں شامل ہیں جن کا
گزشتہ ڈھائی ہزار سال سے انسانی ارتقا میں بیش از بیش حصہ رہا
ہے۔بعض دوسرے بڑے لسانی خاندان بھی ہیں: سامی، عبرانی، حامی،
قبطی... وغیرہ... ان میں بعض زبانوں کا تعلق عظیم تہذیبوں سے ہے اور
ان کے بولنے والے لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ تاہم یہ ہند یورپی
خاندان کی زبانوں کے سامنے ہر جگہ پسپا ہوتی جارہی ہے۔...... ہند
یورپی خاندان زبان انگریزی تو اپنی قومی اور علاقائی حدود کو توڑ کر تقریباً
عالمی بنتی جارہی ہے اور ایک عالمی تمدن کا وسیلہ بن رہی ہے۔ دنیا کے
مختلف حصوں میں بعض پورے پورے ملک میں جہاں ہند یورپی زبان کا
پتہ بھی نہیں تھا اور ان میں یا تو دوسری زبانیں چھائی ہوئی تھیں یا یہ غیر آباد
تھے اب ہند یورپی کے ارتقا اور توسیع کے مرکز ہو گئے ہیں۔'' [۱۶]

چٹرجی کے اس بیان کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔ ہند یوروپی خاندان کی زبانیں بولنے والے کون لوگ تھے؟ ان کا ابتدائی مسکن یا وطن کہاں تھا؟ یہ لوگ ہندوستان میں کب اور کس طرح وارد ہوئے ؟ ہند یورپی کی گیارہ ذیلی خاندانوں میں کس شاخ کا ارتقا ہندوستان میں ہوا ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب سے ہند یورپی خاندان کی ابتدائی تاریخ اور ارتقائی منازل کا واضح تصور قائم کیا جاسکتا ہے۔

☆ ہندوستان میں آریوں کی آمد اور ہند آریائی زبانوں کا ارتقا

مورخین کے پاس اب تک نہ تو اس بات کا کوئی ثبوت ہے اور نہ ہی انہیں یہ علم ہے کہ ابتدائی انسان کا وجود یا ان کا معاشرتی ڈھانچہ کیسا تھا۔ پوری دنیا میں انسان کے وجود اور اس کی تاریخ سے قطع نظر اگر صرف ہندوستان کے تناظر میں اسے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ مورخین نے مختلف

---

[۱۶] ہند آریائی اور ہندی: سنیتی کمار چٹرجی، ص۔۱۰،

زاویے سے سمجھنے کی کوششیں کی ہیں۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ کی ابتدا رگ وید سے ہوتی ہے۔ ۱۷
پرانوں کے حوالے سے تاریخ کا پہلا مرحلہ جو خالصتاً اساطیر پر مبنی ہے تکمیل پاتا ہے اور ایک بڑی تعداد میں
مورخین کے ذہن کی تشکیل کرتا ہے۔ رومیلا تھاپر نے اپنی تصنیف میں اس واقعہ کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔
وہ لکھتی ہیں کہ ایک روایت کے مطابق ہندوستان کا پہلا راجا 'منو' جو براہ راست دیوتا 'برہما' کے بطن سے
پیدا ہوا تھا۔ اسی 'منو' سے مانو یعنی انسانی نسل کی افزائش ہوتی ہے۔ ۱۸ تھاپر قدیم ہندوستان کی تاریخ میں
سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ اس بات سے اتفاق نہیں کرتیں بلکہ تاریخ کے مختلف موڑ (Turning Points)
کے ضمن میں اس واقعہ کا ذکر کرتی ہیں۔ نیز انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں دنیا کی
مختلف زبانوں یعنی ایرانی، ویدک اور یونانی ادب کے متون اور مماثل الفاظ کی بنیاد پر جہاں ایک طرف
زبانوں کے خاندان کا تصور عام ہوا، وہیں دوسری جانب تاریخ نویسی کا دوسرا رجحان فروغ پانے لگا۔ اس
روشنی میں قدیم ہندوستان کی تاریخ کو نیا زاویہ نگاہ مل گیا اور ساتھ ہی زبان کے مطالعہ میں ایک انقلاب
برپا ہو گیا۔ یہاں سر دست سنیتی کمار چٹرجی کے الفاظ میں اس واقعہ کی وضاحت زیادہ مناسب ہوگی جو
آیندہ صفحات میں ہماری گفتگو کا مرکز ومحور ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''سر ولیم جونز نے کلکتہ میں سنسکرت کا مطالعہ شروع کیا اور سنسکرت میں
ایک ایسی زبان کی حیثیت سے جس کی ساخت حیرت انگیز تھی اور جو یونانی
سے زیادہ مکمل، لاطینی سے زیادہ جامع اور ان دونوں ہی سے زیادہ شستہ و
رفتہ تھی، گہری دلچسپی لینا شروع کی اور ان کی قواعد نیز مادّوں کی گہری
مطابقت کے پیش نظر یہ محسوس کیا کہ یہ تینوں زبانیں کسی ایسی مشترک ماخذ
سے نکلی ہیں جو اب معدوم ہو چکا ہے۔ سر ولیم جونز نے یہ بھی محسوس کیا
کہ (Germanic) جرمنک، گوتھی (Gothic) اور کیلٹی (Celtic) نیز

---

۱۷ اے پیپل ہسٹری آف انڈیا (دی ویدک ایج۔۳): عرفان حبیب، وی۔ کے۔ ٹھاکر، ص۔۱
۱۸ اے ہسٹری آف انڈیا: رومیلا تھاپر، ص۔ ۲۸

قدیم فارسی ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جونز کی اس رائے کو علمی
تخیل آفرینی کی عجیب وغریب مثال کہا جاسکتا ہے۔اسی سے زبانوں کے
خاندانوں کے ادعا کی طرف رہنمائی ہوئی اور زبانوں کے تقابلی مطالعے
سے مشترک ماٰخذ کی شہادتیں ملیں اور جدید علم زبان وجود میں آیا۔'' ۱۹

تاریخ کے تیسرے باب کی ابتدا ہڑپا اور موہن جودڑو کی کھدائی اور اس سے اخذ کردہ نتائج سے ہوتی ہے۔ بہرحال اس موضوع کا حق ان اشاروں سے ادانہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کی تفصیل میں جانا زیادہ مناسب ہوگا۔ زمانۂ ماقبل تاریخ ہندوستان میں مختلف قوموں کا سراغ ملتا ہے۔ جو یہاں دنیا کے مختلف خطوں سے آئے آباد ہوئے، ان میں سے کچھ یہیں کے ہوکر رہ گئے اور کچھ نقل مکانی کرکے پھر ہندوستان سے باہر کوچ کر گئے۔ اس خیال سے مورخین متفق ضرور ہیں کہ ہندوستان قدیم الایام سے ہی مختلف قوموں کے ورود کا مرکز رہا ہے۔'' یہ ملک مہذب قوموں کی آنکھوں میں ہمیشہ سے کھبا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی سرسبزی، زرخیزی اور اعتدال ہوا نے بلائے جان ہوکر ہمیشہ اسے غیر قوموں کی گھڑ دوڑ کا میدان بنائے رکھا ہے''۔ ۲۰ ان میں سے بعض نے منظّم سماج اور تہذیب کی بنیاد ڈالی جن سے متعلق باقیات آج بھی تلاش کی جارہی ہیں۔

ہندوستان میں آنے والے قدیم ترین قوم میں حبشی (Negroite) نسل کے لوگ تھے۔ ۲۱ ان کی آمد کا زمانہ ماقبل تاریخ کا واقعہ ہے۔ یہ لوگ افریقہ سے ایران وعرب کے ساحلی علاقوں کے راستے سے ہندوستان آئے اور شمال مشرقی ہندوستان اور برما ہوتے ہوئے جزائر انڈمان کی جانب ہندوستان سے باہر دیگر علاقوں میں آباد ہوگئے جن کے نشانات اب تک جزائر انڈمان میں پائے جاتے ہیں۔ ۲۲ یہ نسل ہندوستانی تہذیب وتمدن میں کوئی اضافہ نہ کرسکی بلکہ شاید بعد میں آنے والے زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے

---

۱۹ ہند آریائی اور ہندی : سنیتی کمار چٹرجی، ص۔۱۰

۲۰ آب حیات : محمد حسین آزاد۔ ص۔۶

۲۱ مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خاں، ص۲۰۔

۲۲ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ: سیّد احتشام حسین، ص۔۲۹،

سامنے اپنا وجود کھو بیٹھی ۔ان کے بعد مغربی ایشیا سے آسٹرک قبیلے آئے ۔ یہ لوگ بھی بہت مہذب نہیں تھے بلکہ ان کی تمدن کی بنیادیں ہندوستان میں ہی آ کر مستحکم ہوئیں ۔ بعد کو مالا بار، انڈونیشیا، ملیشیا، فجی وغیرہ ممالک کی طرف یہ لوگ پھیل گئے اور ایک بڑے حلقۂ اثر میں اس خاندان کی زبانیں آج بھی موجود ہیں جن کا مفصل ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ آسٹرک قبیلے کے بعد دراویڈی ہندوستان میں وارد ہوئے ۔''اس قوم کے ہند و پاکستان میں آنے کا زمانہ سات آٹھ ہزار برس قبل مسیح قرار دیا گیا ہے''۔[۲۳] ان کا اصل وطن مشرق بحر روم کے علاقے اور ایشیائے کوچک کے بعض حصوں کو قرار دیا جاتا ہے۔لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اس خیال کی تردید بھی کی جاتی ہے کہ اس قوم کا تعلق بحر روم اور ایشیائے کوچک سے نہیں تھا۔ علماء کا یہ ماننا ہے کہ آریا قبائل کے لوگ جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو انہیں دراودی اور آسٹرک قوموں کا سامنا کرنا پڑا۔ مزید یہ کہ تہذیب وتمدن کی برتری کے اعتبار سے آریوں کو دراودی پر فوقیت دی جاتی ہے ۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ ہندوستانی علماء کی نظر میں یہاں کی تہذیب وتمدن کی انتہائی منزل اور قدامت ویدک تہذیب میں ہی مضمر تھی ۔ بلکہ بعض کی نگاہ میں ان آریاؤں کی تمدن سے زیادہ قدیم اور مستحکم تہذیب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تاریخ کے مطابق ہندوستان میں آریوں کی آمد کا زمانہ صرف دو ڈھائی ہزار برس قبل مسیح کا ہے۔ اس قوم کی تاریخ کا سراغ ہم صرف ویدوں کے ذریعے سے حاصل کر سکتے ہیں۔ان کی مذہبی کتابوں بالخصوص زبان کی بڑی دیدہ ریزی سے چھان بین کی گئی۔اس کے علاوہ آثار قدیمہ کہیں کہیں سکے یا غیر ملکی سیّاحوں کے اقوال ملے ڈھونڈ کر جمع کیے گئے اور اہل تحقیق اس نتیجے پر پہنچے کہ ممالک ہند میں تمدن کا آغاز آریا قوم کے یہاں آنے کے بعد ہوا۔ مدتوں تک اسی بنیاد پر ابتدائی تاریخ کی عمارت چنی جاتی رہی ۔لیکن ۱۹۲۰ء میں صوبۂ سندھ، سرحد، بلوچستان اور مغربی پنجاب کے بعض مقامات ہڑپا (ضلع مونٹ گمری) اور موہن جودڑو (ضلع لاڑکانہ) کے تازہ انکشاف نے ان علماء کو قطعی طور پر چونکا دیا اور قیاسات پر مبنی ساری عمارتیں منہدم ہو گئیں ۔اس میں زمین کے نیچے سے ہزاروں سال کے پرانے اوزار اور ظروف برآمد ہوئے جو

---

[۲۳] تاریخ تمدن ہند: محمد مجیب، ص۔۵

آریائی عہد کی مصنوعات سے کہیں بہتر تھے۔اس کھدائی میں ایک سے متصل کئی منصوبہ بند اور خاصے بڑے شہر ملے جنہیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قومیت تمدن کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ واقعۃً اس دریافت نے علمی دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ مورخین نے اس تمدن کی تاریخ کا تعین ۲۴۰۰ سے ۱۸۰۰ قبل مسیح کیا ہے۔[۲۴] ان کے دیکھنے اور جانچنے سے ثابت ہو گیا کے آریوں کے ہندوستان میں آنے سے سیکڑوں سال قبل وادئ سندھ میں یہ قدیم تمدن موجود تھا اور اس وقت کے لحاظ سے نہایت ترقی یافتہ تھا۔ وہاں سے ملے کتبے، مہریں، آثار قدیمہ اور انسانی ڈھانچے جن کا بشریاتی مطالعہ کیا گیا اور ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ اس تہذیب کے بانی آریا نہیں بلکہ دراوڑی تھے۔[۲۵] اب یہ بات مسلم ہے کہ آریوں سے قبل ہندوستان میں جس تہذیب کی نشاندہی کی گئی ہے اس کے بنیاد گذار دراوڑی ہی تھے۔

دراوڑیوں کے بعد ہندوستان میں آریوں کا ورود ہوتا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں سے ہندوستان آنے والے قوموں میں آریہ بھی تھے۔ لیکن دیگر قوموں کے مقابلے میں اس قوم کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی تقریباً چار ہزار سال کی مفصل تاریخ موجود ہے اور اس کا ارتقا ایران اور ہندوستان میں ہوا ہے۔ اسے ہم لسانی مواد کے وسیلے سے متعین کرتے ہیں۔ ہند یوروپی جب ایران پہنچے تو ہند ایرانی کہلائے اور جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کی لسانی بنیادوں پر انہیں ہند آریائی سے موسوم کیا گیا۔ آج یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ ہندوستانی قومیت اور یہاں کی تہذیب و تمدن کی تشکیل میں اس قوم کو نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ آریوں کا تعارف کراتے ہوئے ایک مورخ لکھتا ہے کہ:

> ''آریا نسل کی کوئی ایسی علامات نہیں ہیں جن سے وہ پہچانی جاسکیں۔ آریا کے لغوی معنی ہیں ''شریف اور برادری والے'' یہ دراصل کسی نسل کا نام نہیں ہے۔ سب آریا گورے اور قد آور نہیں تھے۔ سب کی ناک اونچی، بال سنہرے اور آنکھیں نیلی نہیں تھیں۔ انہیں آریا صرف اس بنا پر کہتے

---

[۲۴] دی رائز آف سویلائزیشن ان انڈیا اینڈ پاکستان : برجٹ اینڈ آلچن، ص۔ ۳۶

[۲۵] تاریخ تمدن ہند: محمد مجیب، ص۔ ۶

ہیں کے وہ اپنے آپ کو آریا کہتے تھے۔ آریوں کے اصل وطن کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ اب اکثر محقق اس بات پر متفق ہیں کے آریا کا گہوارہ دریائے دینوب کی وادی تھی۔ یہاں سے اس کے قبیلے ادھر ادھر جاتے رہے۔ وہ قبیلے جو ہندوستان پہنچے دانیال سے گذر کر ایشیائے کوچک اور شمالی ایران ہوتے ہوئے آئے جہاں انہوں نے خاصی بڑی سلطنتیں بھی قایم کیں''۔[۲۶]

یہ سچ ہے کہ آریوں سے قبل بعض قوموں نے یہاں ہندوستان میں اپنی تہذیبیں قایم کیں لیکن وقت کے دست برد کی نظر ہوگئیں۔ ان قوموں میں سے بعض یہاں کی تہذیب وتمدن پر ایک حد تک اثر انداز بھی ہوئے اور اس کے لئے اساس فراہم کئے۔ اور بعض چھوٹے عناصر جو یہاں کی تہذیب میں ضم ہوگئے تھے ان کا کوئی وجود ہی باقی نہیں رہا۔ لیکن آریاؤں کے پاس ایک حیرت انگیز زبان تھی اور وہ لوگ سماجی طور طر بڑے منظّم تھے ان لوگوں نے اپنی بہتر تنظیم سے ان مختلف عناصر کو ایک مجموعی شکل عطا کی اور ایک عظیم الشان تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ ہندوستان کی تہذیب وتمدن کے ارتقا میں آریوں کی اہمیت اور خصوصیت چٹر جی کے ان جملوں کے ذریعے سے بیان کی جاسکتی ہے:

''ہندوستانی لوگوں کی تاریخ، مذہب، فکر اور ان کے ممتاز تمدن کے ارتقا میں آریائی زبان ایک عظیم الشان عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آسٹرک اور دراودی لوگوں کے فراہم کردہ تمدنی بنیادوں پر جب آریاؤں نے تمدنی تشکیل شروع کی تو یہ زبان متحدہ تہذیب کی مظہر، اس کی علامت اور اس کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بن گئی.... کبھی سنسکرت کے روپ میں اور کبھی پالی کے، کبھی قدیم شمالی مغربی پراکرت کی حیثیت سے تو کبھی اردھ ماگدھی اور اپ بھرنش کی حیثیت سے آگے چل کر ہندی، گجراتی،

---

[۲۶] تاریخ تمدن ہند: محمد مجیب، ص۔۷۵

مراٹھی، اڑیا، بنگالی نیپالی وغیرہ کی حیثیت سے آریائی زبان مختلف
مقامات پر اور تاریخ کے مختلف ادوار میں ہندوستانی تہذیب میں ناقابل
تحلیل طور پر پیوست ہوگئی۔'' ۲۷

ہندوستان میں آریوں کی آمد کا زمانہ ۱۵۰۰ قبل مسیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ ''اس قوم کا وطن یا ان کی تہذیبی اور تمدنی خصوصیات کی نشاندہی ویدک، ایرانی اور یونانی ادب کے متون کی بنیاد پر ہی کی جاتی ہے۔ یہ ادبی صحیفے جو دنیا کے مختلف علاقوں اور عہد کی تصانیف ہیں ان میں استعمال کی گئی زبانیں ہی مورخین کے لیے مواد فراہم کرتی ہیں۔ 'رگ وید'، 'ژنداوستا' اور ہومر کی 'الیڈ اور اوڈیسی' کے متون اور ان میں استعمال ہوئے مماثل الفاظ، ان کی تہذیبی اور مادّی زندگی کے علاوہ جغرافیائی خصائص کی طرف واضح اشارے کرتے ہیں''۔ ۲۸ رگ وید سے ہی ہندوستان کی قدیم تاریخ کا باب شروع ہوتا ہے۔ تاریخ سے متعلق ایسے ذرائع کو مدنگاہ رکھتے ہوئے اتنی بات یقینی طور پہ کہی جاسکتی ہے کہ مورخین کے لیے آریوں کی تاریخ متعین کرنے کا یہ (Direct Account) تو نہیں ہے پھر بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حالاں کہ یہ سچ ہے صرف رگ وید کیا بلکہ مکمل ویدک دستاویز بھی اس عہد کی تاریخ کی تدوین کے لیے ناکافی ہیں۔ لیکن اس زمانے کے مخصوص حالات اور خصائص معتبر طریقے سے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کیے گئے جو تحریری دستاویز کی حیثیت سے اب ایک معتبر متن کی شکل میں موجود ہیں اور مورخین کے لیے مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کسی بھی قوم کی نقل مکانی کا واقعہ تاریخ میں اچانک رونما نہیں ہوتا بلکہ اس کا سلسلہ سو دو سو سال یا اس سے بھی زیادہ مدت پر محیط ہوسکتا ہے۔ آریوں کی ہندوستان میں آمد اور ان کی نسل اور اصل سے متعلق واضح انداز میں کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ مکمل ویدی ادب میں آریوں نے اپنے نقل مکانی (Migration) کو کہیں محفوظ نہیں کیا ہے اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ نئے جغرافیائی حدود میں

---

۲۷ ہند آریائی اور ہندی : سنیتی کمار چٹرجی، ص۔۹

۲۸ ایڈونٹ آف دی آرینس ان انڈیا : رام شرن شرما، ص۔۱۱

داخل ہو گئے۔ بس لسانیاتی بنیادوں پر ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایران سے ہندوستان کی طرف یہ لوگ بہت سست رفتار میں بڑھے اور شاید یہ عمل کئی نسلوں تک جاری رہا۔ وہ لوگ ایک خطے سے دوسری جانب یا تو خانہ بدوشوں اور قبائلیوں کی خصائص رکھنے کی وجہ سے یا پھر آفات ارضی یا سماوی کے باعث کوچ کرتے گئے۔

کسی تہذیب کی ابتدائی تاریخ یا قوم کی اصل اور نسل اور اس کے وطن تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تاریخی مواد درکار ہوتے ہیں جن کی دو صورتیں ہیں۔ اول ان کی تہذیب اور تمدن سے متعلقہ مادی عناصر مثلاً آثار قدیمہ، سکّے، کتبے اور دوم لسانی وادبی ذخیرے ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ کی سائنٹفک جانچ کی جاتی ہے اور اس سے اس کی قدامت کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اس سائنسی طریقۂ کار کو کاربن ڈیٹنگ (Carbon Dating) کہتے ہیں۔ جب کوئی شئے بے جان ہوجاتی ہے تو C14 نام کے ایک خاص کاربن کی خوراک لینا بند کردیتی ہے۔ اور اس وقت سے C14 ان اشیا میں ضائع ہونے لگتا ہے جسے Radio Activity کہتے ہیں۔ اس طرح جس چیز میں C14 جتنا ہی کم رہتا ہے وہ اتنی ہی قدیم ثابت ہوتی ہے۔ دنیا کی تہذیبوں کی قدامت کا تعین اسی عمل کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ لیکن آریوں کے سلسلے میں افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ قوم کسی ایک جگہ مستقل مزاجی سے مقیم نہیں رہی۔ بلکہ اس میں اپنے مسکن دیرینہ کو تج کر آگے بڑھنے یعنی جہاں بینی وجہاں پیمائی کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا۔ نتیجتاً یہ لوگ کوئی ٹھوس مادی باقیات اپنے پیچھے نہیں چھوڑ سکے۔ یعنی اس قوم کی قدامت کے تعین کا ٹھوس ذریعہ دستیاب ہی نہیں ہوسکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قوم کی ابتدائی تاریخ اور اصل مسکن سے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے میں انتہائی مشکلیں درپیش ہیں۔ ہمارے علماء کے نزدیک اگر کوئی مواد بھی ہے تو ان کی زبان سے متعلق ہے جس میں اختلاف کی خاصی گنجائش ہے۔

اس قوم کی تاریخ سے متعلق مواد کی دوسری صورت ان کا ادبی یا لسانی ذخیرہ ہے۔ آریوں کی تہذیبی خصائص کی نشان دہی کے لیے ان کی زبان نہایت ہی اہم وسیلہ ہے۔ ماہرین لسانیات نے تقریباً چھ سات ہزار سال پہلے بولی جانے والی ابتدائی ہند یوروپی (Proto Indo European) زبان کی بازتشکیل کی کوششیں کی ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ ابتدائی ہند یوروپی کی مغربی اور مشرقی دو شاخیں تھیں۔ ان میں مشرقی شاخ کے صوتی ارتقا کی نشاندہی ابتدائی ہند ایرانی (Proto Indo Iranian) کی حیثیت سے

تقریباً ۴۵۰۰ برس قبل مسیح کی گئی ہے۔لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس سے متعلق کوئی ٹھوس ثبوت یا مواد صرف ۲۳۰۰ سوسال قبل مسیح کا ہی ملتا ہے۔[۲۹] ان کے مختلف ادبی صحیفے کی زبان یہ منکشف کر دیتی ہے کہ آریوں نے کب کہاں کن چیزوں کا استعمال کیا اور انہیں کس نام سے پکارا ہے۔ یونان میں ہومر کی 'الیڈ اوراوڈیسی' کی زبان ہو یا ایران میں 'ژنداوستا' کی، یا پھر ایران سے افغانستان، پاکستان ہوتے ہوئے ہندوستان تک 'رگ وید' کی زبان ہوان میں ہر جگہ الفاظ کی سطح پر مماثلتیں ضرور موجود ہیں۔الفاظ کی یہ مماثلتیں اس بات کا مستحکم جواز فراہم کرتی ہیں کہ آریا جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ان کی زبان بھی ان کے ساتھ گئی اور بعد کی زبانوں میں پہلے کی زبانوں کا اشتراک برقرار رہا جن کے الفاظ اپنے سابقہ مسکن کی طرف اشارے کرتے گئے۔ پالتو جانوروں میں گھوڑا، کتا، اور نباتات میں برچ، بید، شاہ بلوط، دیودار وغیرہ پیڑوں کے نام، سواری میں رتھ کا استعمال صرف آریا کرتے تھے یہ تمام چیزیں اس امر کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں کہ آریا جہاں بھی گئے ان کا سروکاران اشیا سے رہا۔اور یہ تمام خصائص آج سبھی ہند یوروپی زبانوں میں تقریباً ایک سے پائے جاتے ہیں۔جغرافیائی اعتبار سے دیکھیں تو یہی الفاظ ٹھیک اسی طرح ذراسی شکلی تبدیلیوں کے ساتھ یوریشیا کے پودھے اور جانوروں کی آج بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہند یورپی قوم کی مادی تمدن کا افسانہ زیادہ تر لسانیاتی رکارڈوں پر ہی مبنی ہے۔

ہند یورپی خاندانوں کی زبانوں کی گیارہ شاخیں بتائی گئی ہیں۔ یہ لوگ اپنے ابتدائی مسکن سے جدا ہوکر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور اپنے ساتھ وہ قدیمی زبان بھی لے گئے جو ابتدا میں غیر منقسم حالت میں بول رہے تھے۔نئی جگہ پہنچ کر ان کا واسطہ دوسری زبانوں سے بھی پڑا اور ان کی اپنی زبانیں جسے وہ اپنے ساتھ لے گئے، تبدیل بھی ہوئیں۔ان کی یہ تبدیل شدہ زبان ایک نئی زبان کی نشونما کہہ لیں یا پھر قدیم زبان کی مرتقی شکل۔پھر بھی ان کی نئی زبان میں اس قدیم زبان کا اشتراک مدت مدید تک برقرار رہا۔ اس لیے ان لسانی شواہد کی بنیاد پر دنیا میں بولی جانے والی زیادہ تر زبانوں کا رشتہ ان کے لفظوں اور فقروں کی ساخت کے اعتبار سے ہند یورپی خاندان کی ابتدائی زبان سے جوڑا جاتا ہے اور اسے مختلف زبانوں کا

---

[۲۹] ایڈونٹ آف دی آرینس ان انڈیا : آر۔ایس۔شرما، ص۔۲۸

ماخذ قرار دیا جاتا ہے۔ابتدائی ہند یورپی خاندان کی زبان بولنے والوں کو ماہرین لسانیات Wiros کے نام سے یاد کرتے ہیں۔[۳۰] اس گروہ یا جتھے میں مختلف نسل کے لوگ شامل تھے لیکن ان کی زبان ایک تھی اور یہی لوگ دنیا میں مختلف ہند یورپی خاندان کی زبانیں بولنے والوں کے مورث اعلیٰ کہلائے۔ وروس wiros کے اصلی جانشین کون لوگ تھے اس بات کو لے کر علماء میں خاصا اختلاف ہے۔لیکن اتنی بات تو وثوق کے ساتھ کہی جارہی ہے کہ آریوں کا تعلق اسی مختلف النوع نسل کے قوم Wiros سے ہی رہا ہے۔ یہ لوگ غیر منقسم حالت میں کب اور کہاں موجود تھے تاریخ میں اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی اور مسکن کا ذکر انہیں کی قدیم کتابوں میں کہیں نہیں ملتا ہے۔مزید یہ کہ یہ قوم اپنے اصل وطن سے کب اور کس طرح دنیا کے دوسرے ممالک میں پھیل گئے کچھ کہنا مشکل ہے۔آریوں کی ابتدائی تاریخ سے متعلق یہ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابوں سے ماہرین آج بھی متفق اور مطمئن نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں بس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ تحقیق اور قیاسات کا سلسلہ جاری ہے۔ہاں موجودہ لسانی مواد کے تقابلی مطالعے سے آریوں کے اصل وطن اوران کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں کچھ قرین قیاس نتائج ضرور نکال لئے گئے ہیں۔اسی لیے مورخین کو بھی اس حقیقت کا اعترف ہے کہ ’’بلا شبہ ہند یوروپی زبانوں کے ماہرین نے علم زبان اورقدیم تاریخ کے لیے راہیں ہموار کی ہیں‘‘۔[۳۱]

آریوں کی تمدن سے متعلق باقیات اورلسانی یا ادبی مواد یہ دونوں اس بات کے شاہد ہیں کہ آریائی زبان کا ارتقا صرف ہندوستان میں ۳۵۰۰ سال تک ہوا ہے۔حالاں کہ آریوں نے اپنے ویدی ادب میں کہیں بھی اپنے ابتدائی مسکن یا ایران اور ہندوستان میں ورود کا واقعہ بیان نہیں کیا ہے۔پھر بھی ان کے لسانی اورادبی مواد کے ذریعہ ان کی ابتدائی تاریخ تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ماہرین نے بنگالی، گجراتی، ہندی اور پنجابی کے بعض لفظوں اور جملوں کی ساخت کو ابتدائی ہند یورپی زبان سے مشابہ قرار دیا ہے۔[۳۲] لسانیات میں

---

[۳۰] ہند آریائی اور ہندی: سنیتی کمار چٹر جی،ص۔۱۸

[۳۱] ایڈونٹ آف دی آرین ان انڈیا: رام شرن شرما،ص۔۱۰

[۳۲] ہندی اور ہند آریائی: سنیتی کمار چٹر جی،ص۔۹

ایسا تب ہی ممکن ہے جب لفظوں کی مسافت یعنی امتداد زمانہ کے باعث الفاظ کی صوتی تبدیلیاں اور فقروں کی بناوٹ میں مشابہت بہ آسانی تلاش کر لی جائے۔ اس اعتبار سے ہند یوروپی کی تاریخ ابتدا تا حال قریب ساڑھے پانچ ہزار سال پر محیط ہے۔ اس اجمال کی تفصیل اس طرح بیان کی جاسکتی ہے کہ ۱۵۰۰ قبل مسیح تا حال غالباً ۳۵۰۰ سال کی واضح تاریخ ہندوستان میں ملتی ہے۔ اس سے قبل قریب ایک ہزار سال کی تاریخ ایران، عراق، اور ایشیا کوچک میں۔ اور مزید اس سے ہزار سال پیشتر کی تاریخ کی نشاندہی موجودہ لسانی مواد کے ذریعہ ممکن ہے۔ ہندیورپی کے ارتقاء کا تعین ابتدائی ہندیورپی، ہندایرانی اور ہندآریائی کی شکل میں کیا جاسکتا ہے۔

ہندیورپی خاندان کی ابتدائی تاریخ اور اس کے مسکن سے متعلق علماء میں خاصا اختلاف رہا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر مختلف نظریات کا ذکر ملتا ہے۔ ان حضرات نے اپنے اپنے خیال کی موافقت میں دلیلیں پیش کی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہندو عقیدے کے رو سے آریا ہندوستان کے قدیم باشندے تھے۔ شاید اسی لیے سنسکرت کے بعض عالموں کا خیال ہے کہ آریا قبائل ہندوستان ہی کی پاک سر زمین سے اٹھے اور بعد میں ایران و یوروپ میں پھیل گئے۔ [۳۳] دراصل یہ نظریہ سوامی دیانند نے رگ وید کے غائر مطالعے کے بعد پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق کے رگ وید میں یہ اشارے موجود ہیں کہ آریا ہندوستان میں پروسی ملک تبت سے آئے۔ [۳۴] ڈاکٹر اے۔ سی۔ داس نے خاص طور سے اس امر پر زور دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آریوں کا اصل وطن سپت سندھو کا علاقہ ہے اور اس بات کی تائید ان کے قبیل کے مورخین نے بھی کی ہے۔ [۳۵] سپت سندھو یعنی سندھ کی دو اور پنجاب کی پانچ ندیوں کے علاقے۔ اس خیال کی موافقت میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جس طرح ویدی ادب میں اس بات کے کہیں اشارے نہیں ملتے کہ آریا بیرون ملک سے ہندوستان میں وارد ہوئے اسی طرح انہوں نے یہ بات

---

[۳۳] مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خاں، ص۔ ۲

[۳۴] سنسکرت ٹکسٹ بک جلد دوم، ص۔ ۲۲۳

[۳۵] ...... رگ ویدک کلچر: ابیناس چندر داس، ص۔ ۶۳

بھی کہیں کھل کرنہیں کہی کے ان کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے ہی ہے۔لیکن ویدی متن میں پائے جانے والے بیانات اس مفروضے کی توثیق کے لیے کافی ہیں۔مثال کے طور پر 'فلورا اور فونا' کا ذکر ویدوں میں آیا ہے جو پنجاب میں موجود ہے۔مزید اس متن میں جن جگہوں کے نام ملتے ہیں ان کا محل وقوع ہندوستان ہی ہے۔خاص بات یہ ہے کہ آریوں کا ویدوں کی طرح کا کوئی بھی ادبی کارنامہ ہندوستان سے باہر دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔''کیمبرج ہسٹری آف انڈیا'' میں پروفیسر Giles ہند یوروپی زبانوں کی بنیاد پر آریوں کا اصل وطن دریائے ڈینوب کے سواحل بتاتے ہیں۔مزید جغرافیائی اور تاریخی وجوہ کی بنا پر آریوں کے پھیلنے کا مرکز آسٹریا اور ہنگری بتایا ہے اسی لیے ان کا نظریہ Austro-Hungarian Theory کے نام سے مشہور ہے۔[۳۶] میکس مولر (F.Max Muller) کے مطابق آریوں کا ابتدائی وطن وسطی ایشیا کا علاقہ ہے جہاں ہندوستانی، ایرانی، یونانی، رومی، جرمانی اور کلٹیوں کے آبا و اجداد ایک ساتھ رہتے اور ایک ہی زبان بولتے تھے۔یہ اور بات ہے کہ وہ سب اپنے اصل اور ذہنی افتاد میں کتنے ہی مختلف رہے ہوں اس باعث نسلی نہ سہی لیکن لسانی موروث اعلی ضرور کہے جاسکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی الفاظ کی سطح پر ان مختلف زبانوں میں مماثلتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔میکس مولر نے اپنے نظریے کی تائید میں جو دلیلیں پیش کی ہیں وہ یہ کہ ۱۹۰۶ء میں ایشیائے کوچک میں ملے دستاویز یا رکارڈ یہ ثابت کرتے ہیں کہ رگ وید میں جن دیوتاؤں مثلاً اندرا، ورونا کا ذکر ملتا ہے جن کی وہ لوگ پوجا کرتے تھے وہ نام سنسکرت کی مقدس کتابوں میں جوں کے توں موجود ہیں۔فلورا اور فونا جن کا ذکر رگ وید میں ملتا ہے اس کی شواہد وسطی ایشیا میں بھی پائے گئے ہیں۔[۳۷] مشہور اطالوی ماہر بشریات سرجی (Sergi) کا بھی یہ خیال ہے کہ آریا ایشیائے کوچک (Asia Minor) کے سطح مرتفع کے باشندے تھے۔Letham کا ماننا ہے کہ آریوں کا اصل وطن یورپ میں کہیں رہا ہوگا۔[۳۸] رومیلا تھاپر لسانی ذرائع کی بنیاد پر ہی ہند یوروپیوں کے ابتدائی مسکن کا تعین کرتے

---

۳۶ ایچ، اے، جلس، ٹراولز آف فاہیان، ص ۔ ۸۵

۳۷ مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خاں، ص۔۶

۳۸ ہندی اور ہند آریائی: سنیتی کمار چٹرجی، ص۔۱۴

ہوئے فرماتی ہیں کے قبائیلیوں کا یہ جتھا بحرکیسپین اور جنوبی روس کے علاقے سے اٹھتا ہے اور اور اپنے مویشیوں کے لیے چراگاہیں تلاش کرتا ہوا آہستہ آہستہ مختلف قبیلوں میں منقسم ہوکر سبزہ زار اور زرخیز علاقوں کی جستجو میں مختلف خطوں میں پھیل جاتا ہے۔اس کا ایک گروہ یونان، ایشیائے کوچک ہوتا ہوا ایران اور پھر ہندوستان میں داخل ہوتا ہے اور اس عہد تک یہ لوگ 'آریا' کے نام سے موسوم کیے جانے لگے۔[۳۹]

متذکرہ بالا نظریات محققین کے علمی مشاہدے اور دستیاب رکارڈوں کی دلائل پر مبنی ہیں۔صرف یورپ یا صرف ہندوستان آریوں کا اصل مسکن تھا ایسے نظریات میں سے کسی ایک کو اگر تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس میں قباحت یہ ہے کہ کسی بھی قوم کا نسلی و تہذیبی اختلاط کرۂ ارض کے کسی ایک جانب اس قدر وسیع نہیں ہوسکتا ہے۔ بلکہ کسی بھی قومیت یا تہذیب کے لوگ جہاں رہ رہے ہوتے ہیں اپنے اطراف و جوانب کو متاثر ضرور کرتے ہیں۔اور یہی عوامل ان کے توسیع کا باعث بنتے ہیں۔یعنی اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ یورپ میں بحیرۂ بالٹک کے سواحلی ملک جرمنی اور پولینڈ آریوں کے ابتدائی مسکن تھے تو اس قوم کی توسیع جنوب اور مشرق کی جانب ہی عمل میں کیوں آئی جب کہ اس کے گردونواح کے ملک بھی اس قوم کا حلقۂ اثر بن سکتے تھے۔لیکن تاریخ میں اس قوم کے جتھے ان علاقوں میں بہت بعد میں اور ایشیا میں اس سے قبل نظر آتے ہیں۔[۴۰] ٹھیک اسی طرح اگر آریوں کا ابتدائی مسکن ہندوستان مان لیا جائے تو ایران اور میسوپوٹامیا (عراق) سے لگے مشرق وسطیٰ یعنی عرب ممالک پر اس قوم کے اثرات نظر نہیں آتے۔ بلکہ ان پڑوسی ممالک کی زبانوں کا تعلق بھی دنیا کے دوسرے خاندان السنہ سے ہے۔آریوں نے اپنے سامنے ان قریبی علاقوں کو چھوڑ کر یورپ کے دور دراز علاقوں کی طرف ہی رجوع کیوں کیا۔

جدید محققین متفقہ طور پر وسطی ایشیا کو آریوں کا ابتدائی مسکن تسلیم کرتے ہیں۔ان کے مطابق یہی وہ ایک مخصوص علاقہ ہے جہاں سے آریا یورپ اور ایشیا کے وسیع خطے میں پھیلے تھے۔اس نظریہ کی تصدیق ان بوغاز کیوئی (Boghaz Koi) دستاویزات سے بھی ہوجاتی ہے جو ۱۹۰۶ء میں ایشیاء کوچک (Minor Asia)

---

[۳۹] اے ہسٹری آف انڈیا: رومیلا تھاپر، ص۔۲۸

[۴۰] ہندی اور ہند آریائی: سنیتی کمار چٹرجی، ص۔

میں دریافت ہوئے ہیں۔ان کا تعلق مٹیوں سے متعلق ۱۵۰۰ قبل مسیح کے بعض معاہدات سے ہے۔اس کے علاوہ ان رکارڈوں میں ان کے دیوی دیوتاؤں کا بھی ذکر ملتا ہے۔مثلاً اندرا،ارون یا ارونا،می اتاراجن کا ذکر تاریخ میں آگے چل کر ویدوں میں بھی کیا گیا ہے۔چنانچہ الفاظ کا ذخیرہ بھی اس امر میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔اس کے ذریعہ قومیں یا نسلیں اپنے مسکن کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔اسی کے ذریعے اس کی اصل ونسل یا تہذیب وتمدن کی ابتدائی خصوصیت کی عقدہ کشائی کی جاتی ہے۔ہند یوروپیوں کے تہذیب و تمدن سے متعلق ہمارے قیاسیات کا انحصار زیادہ تر لسانی عدم واقفیت پر ہی مبنی ہے۔جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہند یورپی مہذب وحشی لوگ تھے۔یہ عدم استقامت کی وجہ سے نئے وطن کی تلاش میں یورپ و ایشیاء کے مختلف خطوں میں پھیلتے چلے گئے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پیچھے خاطر خواہ مادی باقیات نہیں چھوڑ سکے تاکہ اس کے ذریعے سے ان کی ابتدائی تاریخ تک رسائی حاصل کی جا سکے۔پھر بھی موجودہ مواد سے ایسا لگتا ہے کہ بہت ہی ابتر حالات میں بھی انہوں نے اپنی قبائلی تہذیب کی صورت مسخ نہیں ہونے دی۔ اوران سے جب دوسرے قوموں کا سابقہ پڑا تو وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ایسی ممتاز تہذیب وتمدن کی شناخت قائم رکھنے میں ان کی زبان بہت حد تک اہمیت کا حامل رہی ہے۔

محققین نے لسانی مواد کے ذریعے سے ان کی اصل اور ابتدائی وطن کی خصوصیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ان میں ڈبلو۔براندنیستائن (W.Brandenestein) کا نام خاصا اہم ہے۔ان کے مطالعے اور مشاہدے کی تفصیلات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کی ہیں۔[۱۴] براندنیستائن نے ۱۹۳۶ء میں ہند یوروپیوں سے متعلق لسانی شہادتوں کی نشاندہی کرکے ان کی تاریخ واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ان کے مطابق ہند یورپیوں کی ابتدائی بولیوں میں دو واضح ادوار تھے۔ پہلے دور میں ہند یوروپیوں کی ایک ایسی زبان تھی جسے وہ غیر منقسم حالت میں بولتے تھے اور ان کی زبان میں کسی طرح کے اختلافات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ان کی زبان کے الفاظ اور مادّوں کے متعین معنی تھے۔ دوسرے دور میں وہی لوگ مختلف جماعتوں میں تقسیم ہوکر یورپ اور ایشیاء کے مختلف علاقے میں پھیل گئے۔

---

۱۴؎ ہندی اور ہند آریائی: سنیتی کمار چٹرجی، ص۔۱۶

نقل مکانی اور امتداد زمانہ کے ساتھ ان کی بولیوں میں تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں صرف صوتی سطح تک محدود نہیں رہیں بلکہ ان کے الفاظ اور مادّوں میں نئے معنی بھی پیدا ہو گئے۔ لیکن ان میں سے ایک گروہ جو بعد میں ہند ایرانی کہلایا ایسی تبدیلیوں سے ایک حد تک محفوظ رہا۔ اس گروہ کی زبان میں بھی تبدیلیاں واقع ہوئیں لیکن اس کے باوجود اس کے اندر قدیم بولی کا اشتراک برقرار رہا۔ یعنی مادوں کی ابتدائی شکل اور ان کے معانی کی صورتوں کو برقرار رکھنے کی خصوصیت صرف ہند ایرانی جماعت میں ہی باقی رہی۔ جب کہ غیر ہند ایرانی جماعت میں مادوں اور الفاظ میں نہ صرف صوتی تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ان کے ساتھ ان کے نئے معنی بھی پیدا ہو گئے، جو ہند ایرانی شاخ کے الفاظ اور معنی سے بالکل الگ تھے۔ ابتدائی ہند یوروپیوں سے ہند ایرانیوں اور آریاؤں کے الفاظ، مادے اور ان کے معانی کی یکسانیت اور اشتراک ایک حد تک برقرار رہ جانے کی وجہ سے ان کے وطن اور اس کی قدرتی خصائص کی نشاندہی کر لی گئی ہے۔ اس بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اصلاً وسطی ایشیا کے باشندے تھے۔ ان کے یہاں کچھ پودھوں، جانوروں اور اشیا کے نام ملتے ہیں جو ہند آریائی زبانوں میں موجود ہیں اور یہی الفاظ آج بھی یوریشیائی جانوروں، پودھوں اور اشیا کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہاں جو باتیں قرین عقل ہیں اور محققین بھی متفق ہیں وہ یہ کہ ابتدائی ہند یورپی کا اصل مسکن کوئی ایسا علاقہ رہا ہوگا جہاں سے اس قوم کے مختلف قبیلوں نے جداگانہ سمت اختیار کیا ہوگا۔ یہ لوگ دنیا کے مختلف خطوں میں ایک دائرے کی شکل میں پھیل گئے ہوں گے۔ ان قبیلوں میں نئی آب و ہوا میں پہنچنے کے بعد بھی ابتدائی نسل و تہذیب کے اثرات برقرار رہے ہوں گے۔ اس کی مشابہتوں کی نشاندہی آج بھی ہندوستان ، پاکستان، افغانستان، ایران، ترکمنستان، جنوبی روس اور سائبیریائی علاقوں کے علاوہ بحر اٹلانٹک کے سواحل جرمنی و پولینڈ اور یورپ کے دیگر ممالک تک جس کا سلسلہ ملتا ہے، کر سکتے ہیں۔ یعنی کوئی قوم اپنے گردونواح کے قوموں سے ہی اپنا اثر ورسوخ اور نسلی و تہذیبی اختلاط قائم کر سکتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے پیچھے اس قوم کی تجسس پسندی یعنی نئے وطن کی تلاش ہو۔ یا پھر آفات ارضی و سماوی کے باعث ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کر کے ایک بڑے خطہ میں پھیل گئے ہوں۔ بہ حیثیت مجموعی مذکورہ باتوں کی روشنی میں آریوں کے وطن سے

متعلق ''وسطی ایشیا'' والے نظریہ کو تقویت ملتی ہے۔ اور آریوں کے وطن سے متعلق یہی خیال علماء کے نزدیک قابل قبول بھی ہے۔ متذکرہ لسانی مماثلتوں سے اتفاق کرتے ہوئے آریوں کے اصل مسکن کا تعین کرتے ہوئے چٹرجی لکھتے ہیں:

''وسطی ایشیا ہند یوروپیوں کا اصل زاد بوم ہے۔ اس طرح کوہ یورال کے جنوب میں وسیع یوریشیائی (Eurasian) میدان ابتدائی ہند یوروپیوں کا اصل وطن ہوگا۔ ہند یوروپیوں کی ایک شاخ (جو ہند یوروپیوں کے اجداد رہے ہوں گے) شاید وہاں رہ گئی اور اصل جمعیت مغرب کی طرف اس علاقے میں چلی گئی جسے آج پولینڈ کہا جاتا ہے۔ یہی علاقہ یوروپ میں (Wiros) کے پھیلنے کا مرکز بنا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے ہند آریاؤں اور ایشیائے کوچک کے حتیوں کے اجداد نے شمالی وسطی ایشیائی جنگلات کے اپنے اصلی وطن کو چھوڑا اور جنوب مغرب کو چل کر کاکیشیا سے ہوتے ہوئے تیسرے الف قبل مسیح کے دوسرے نصف میں ایشیائے کوچک میسوپوٹامیا اور ایران میں پہنچے اور یوروپی جماعت مغرب کی سمت بڑھ گئی''۔[۴۲]

ہم دیکھتے ہیں کہ اس قوم کے لوگ مختلف شاخوں میں جدا ہو کر دنیا کے دیگر خطوں میں پھیل جاتے ہے۔ بعد کی تاریخ میں ان کی زبان میں جن غیر ملکی عناصر کی مداخلت ہوتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سابقہ میسوپوٹامیہ کے لوگوں اور سمیریوں کی تہذیب سے بھی پڑا تھا۔ ان کی ایک شاخ بحیرۂ بالٹک کے سواحل جرمنی و پولینڈ کی جانب بڑھ گئی جہاں سے یورپ کے دیگر تمام خطوں میں پھیل گئی۔ یہ شاخ وہاں کی تہذیب و تمدن اور زبانوں پر اس قدر اثر انداز ہوئی کہ مغرب میں یونان جیسی عظیم تہذیب کے وجود کا باعث بنی۔ اس قوم کی دوسری شاخ جنوب مغرب کی جانب چل کر تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح ایشیائے کوچک پہنچی اور غالب گمان یہ

---

[۴۲] ہندی اور ہند آریائی: سنیتی کمار چٹرجی، ص۔۱۸

[۴۳] دی ورلڈ بک انسائکلوپیڈیا، ص۔۲۶۹

ہے کہ اپنی اصل جمیعت ہند یورپیوں سے جدا ہونے والا یہ پہلا گروہ حیتوں (Hittite) کا تھا۔ ۴۳ ایشیاے کوچک کے علاوہ میسوپوٹامیا اور سیریا کے بیشتر حصوں پر بھی ان لوگوں نے اپنا اقتدار قایم کرلیا۔ کئی سو سالوں تک یہ لوگ مشرق وسطیٰ میں غالب قوت بن کر مقیم رہے اور اپنی اصل شاخ سے اس قدر بیگانہ ہوئے کہ ان کی زبان میں بے حد تبدیلیاں رونما ہوگئیں۔ وہ لوگ بین الاقوامی معاملات میں اکاڈین زبان کا استعمال کرتے تھے۔ اس کے بعد جلد ہی ہند ایرانیوں کی شاخ ایشیائے کوچک ہوتے ہوئے میسوپوٹامیا (موجودہ عراق) تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی شہادتیں دو ہزار قبل مسیح سے ملنے لگتی ہیں۔ پھر وہاں سے بھی نقل مکانی کرکے مشرق کی جانب یہ لوگ ایران پہنچتے ہیں جہاں ان کی زبان میں فطری تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔

آریا ایک مکمل زبان جس کا ارتقا ایران میں ہوا اور مختلف گروہوں کی معمولی اختلافی بولیوں کے ساتھ تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح ہندوستان میں وارد ہوئے۔ ان کی آمد کا یہ سلسلہ مختلف قبیلوں میں صدیوں تک جاری رہا۔ آریوں سے قبل یہاں دراوڑی اور آسٹری موجود تھے۔ اور ایسا قیاس کیا جاتا ہے کہ ان دونوں قوموں میں ربط و اتحاد اور یگانگت نہیں تھی۔ خود کو فاتح سمجھنے والے آریا جو مادی تمدن میں پس ماندہ تھے، لیکن جنگی صلاحیت تنظیم، دوسری قوموں کے تجربہ اور عملی مفہوم کے اعتبار بہت طاقتور تھے اور اس طرح کے گروہوں پر ایک ایک کر کے فتح حاصل کر سکتے تھے۔ دوسری جانب دراوڑی اگرچہ کئی لحاظ سے ان قبائلیوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب تھے لیکن جنگی معاملات میں زیادہ طاقتور نہیں تھے۔ اس لیے آریوں کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور ایک مفتوح کی حیثیت سے ان میں سے بیشتر شمالی ہند کا علاقہ خالی کر کے جنوب کی طرف چلے گئے۔ چوں کہ پوری طرح شمالی ہند کا علاقہ خالی کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے بعضوں نے مزاحمت سے زیادہ مفاہمت کی صورت اختیار کی اور وہیں مقیم رہے۔ ایسے میں آریاؤں کو ان باشندوں پر اپنے اثرات ڈالنے کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ جن سے ان کا تہذیبی، مذہبی اور لسانی اختلاط فطری طور پر روبہ عمل آیا اور دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا۔ چوں کہ آریا تعداد میں بہت کم تھے، ان کو یہاں کی آب و ہوا کے زیر اثر مقامی زندگی کے طور طریقوں کے مطابق خود کو بھی ڈھالنا پڑا اور رفتہ رفتہ زندگی کی خارجی آریائی طور طریقوں اور اپنی اصل خصوصیات کو چھوڑتے چلے گئے۔ بالآخر ان کی آریائی اور بدیسی حیثیت ختم سی ہو

گئی اور جلد یا بدیر وہ ہندوستانی ہو گئے۔ تہذیبی سطح پر انہوں نے بہت ساری چیزیں غیر آریاؤں سے قبول کیے مثلاً کھانے پینے کی چیزیں پان سپاری، بعض دیوی دیتاؤ کے تصورات اور دیو مالا لباس میں میں دھوتی ساری یہ خالص دراویدی عناصر ہیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان دونوں قوموں کی زبانیں اپنی ساخت کے اعتبار سے مختلف تھیں پھر بھی آریائی زبان کی قواعد اور صوتیات پر کافی اثر پڑا اور ان کی زبان فطری طور پر بدلنے لگی اور ہند ایرانی منزل سے گذر کر ہند آریائی (Indic) کے حدود میں داخل ہو گئی۔ اس زبان کی قدیم شکل ہمیں رگ وید میں ملتی ہے۔ یہ آریائی زبان کی تاریخ کا نقطۂ آغاز تھا۔ جو اپنی اصل وروس (Wiros) کی زبان سے دو منزل آگے بڑھ چکی تھی۔ یہاں ایران میں جن زبانوں کا ارتقا ہوتا ہے وہ ہند ایرانی شاخ کی زبانیں کہلاتی ہیں۔ اسی شاخ کا دوسرا گروہ ہندوستان کی جانب کوچ کر جاتا ہے جسے ماہرین زبان ہند آریائی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہند ایرانی منزل کے ارتقا اور اس کے تاریخی تسلسل کا تعین کرتے ہوئے مسعود حسین خاں فرماتے ہیں:

> ''یہ امر یقینی ہے کہ ہند یوروپی زبان بولنے والے آریا اپنے داخلۂ ہند سے قبل عرصے تک مشرقی ایران میں قیام کر چکے تھے، جہاں ان کی زبان ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی دو ہزار قبل مسیح تک ''ہند ایرانی منزل'' تک پہنچ جاتی ہے ''ہند یوروپی'' زبان کی یہ ''ہند ایرانی'' شکل ہی ان تمام زبانوں کی ماں کہی جا سکتی ہے جو بعد کو ایران میں پھیلیں اور جسے آریا بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے۔''[۴۴]

ہندوستان میں آریوں کی زبان کا پہلا نقش ہمیں رگ وید کی شکل میں ملتا ہے۔ ہند آریائی زبانوں کا ارتقا ہند ایرانی سے ہوا ہے اور ہند ایرانی قدیم ہند ایرانی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ بوغاز کیوئی (Boghaz-Koi) اور بعض دوسرے مقامات کے دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ میسو پوٹامیہ کی زبان بھی قدیم ہند ایرانی سے ملتی جلتی ہے۔ اور اسے بابلی رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ یہ ہند آریائی بولیاں بولنے

---

[۴۴] مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خاں، ص۔۶

والے لوگ قبل ہند ایرانی تھے۔ جن میں سے یا تو کچھ میسوپوٹامیہ اور ایشیائے کوچک میں رہ گئے اور کچھ ایران اور ہندوستان کی طرف بڑھ گئے۔ اس طرح صرف ہندوستان، ایران، میسوپوٹامیہ اور ایشیائے کوچک تک ہند آریائی زبان کا سلسلہ چار ہزار پانچ سو سال (۴۵۰۰) کی ارتقائی تاریخ پر محیط ہے جس کے واضح خطوط قائم کئے جاسکتے ہیں۔

☆ ہند آریائی کے تین ادوار

ہندوستان میں آریوں کی لسانی ارتقا کی تاریخ کو ماہرین لسانیات نے تین ادوار میں منقسم کیا ہے۔ اس کا پہلا دور قدیم ہند آریائی، دوسرا وسطی ہند آریائی اور تیسرا جدید ہند آریائی کہلاتا ہے۔ پہلا دور آریوں کی ہندوستان میں آمد تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۵۰۰ ق۔م تک یعنی ایک ہزار سال کی تاریخ پر محیط ہے۔ اسے قدیم ہند آریائی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دوسرا دور ۵۰۰ ق۔م۔ تا ۱۰۰۰ء پر مشتمل ہے۔ یہ پراکرتوں کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اس عہد میں تین پراکرتیں مستعمل تھیں اور ہر ایک کا زمانہ تقریباً پانچ سو سال کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اسے وسطی ہند آریائی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وسطی ہند آریائی کے بعد جدید ہند آریائی زبانوں کا دور شروع ہوتا ہے جو ۱۰۰۰ء تا حال تسلیم کیا جاتا ہے۔

☆ قدیم ہند آریائی عہد

ہند آریائی کی ابتدائی تاریخ میں اس دور کو ویدک دور کہا جاتا ہے۔ مزید آسانی کے لیے اس قدیم ہند آریائی عہد کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا ویدوں کی تصنیف اور تدوین کا زمانہ ہے۔ اس لئے اسے ویدک سنسکرت کا عہد کہا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں رامائن اور مہابھارت جیسی شاہکار تخلیقات عمل میں آئیں۔ چوں کہ ان دونوں کا شمار ادبی نوعیت کی تخلیقات میں ہوتا ہے اس لیے اس زمانہ کو ادبی یا کلاسیکل سنسکرت کے دور سے موسوم کیا گیا ہے۔ کلاسیکل سنسکرت کے اولین نقوش آخری براہمنوں، اپنشدوں اور سوتروں میں ملتے ہیں۔

ہندوستان میں آریوں کی آمد قبائل میں ہوئی۔ ان کی ہند ایرانی منزل میں ہی مختلف قبیلوں کی بولیوں میں معمولی اختلافات موجود تھے۔ ان اختلافات کے باوجود دراصل عوام کی ایک مخلوط زبان تھی۔

پہلے پہل یہ اختلاف معمولی لیکن بعد میں ایک شستہ اور پاکیزہ زبان بھی بن گئی تھی جسے آریا اپنے مناجاتوں اور حمدیہ نظموں میں استعمال کرتے تھے۔ آریوں کی ابتدائی زبان سے ہی ویدک اور ادبی سنسکرت پیدا ہوئی ہے۔ اس میں آریاؤں کی ابتدائی زبان اور مختلف دیسی بولیوں، دونوں کا میل تھا۔ ویدک سنسکرت اسی ابتدائی زبان کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی اور کافی عرصے تک برہمنوں کے گھروں اور ان کی مذہبی کتابوں میں اس کا استعمال عام رہا۔ یہ آریوں کی وہ زبان تھی جسے وہ اپنے آبا سے ورثے میں لے کر یہاں آئے تھے اور اسے انہوں نے بھجنوں اور مذہبی نوعیت کی نظموں کی شکل میں محفوظ رکھا۔ آریائی مہاجروں نے اس ترکہ کو زبانی یادداشتوں کے سہارے سینہ بہ سینہ کئی نسلوں تک منتقل کیا اور اس کی بنیادی خصوصیت برقرار رکھنے کی شعوری کوشش کی۔ بہت بعد میں وہ نظمیں محفوظ رکھنے کے لیے ضبط تحریر میں لائی گئیں۔ یہ متن پہلی مرتبہ ضبط تحریر میں آنے کے بعد گذشتہ تین ہزار سال سے بے حد محتاط انداز میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ رگ وید جسے ہند آریائی زبان و ادب کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے اور جس کے کے ذریعے سے ہی ہم آریائی زبان سے متعارف ہوتے ہیں۔ اسے بعد میں کافی منظّم کیا گیا اور آج یہ متن کافی معتبر صورت میں موجود ہے۔ اس کا دوسرا وصف یہ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے قدیم متن ہے۔ اس لئے اسے نوع انسان کا پہلا عہد نامہ کہا گیا ہے۔[۴۵] رگ وید کے ابتدائی حصے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل مسیح کی زبان پر مبنی ہے اور آخری ابواب تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں تصنیف ہوئے۔[۴۶] صرف ہندوستان میں ''رگ وید'' کی تدوین میں دو رسم الخط دراوڈی اور برہمی کا استعمال ہوا ہے۔ ہندوستان سے قبل اس کا ابتدائی حصہ ہند ایرانی منزل میں لکھا جاچکا تھا۔ آخری باب کی تکمیل تک آریا وادیِ سندھ اور جمنا کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ اس طرح جہاں ایک طرف ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رگ وید کی تالیف کا زمانہ، قدیم ہند ایرانی سے ابتدائی ہند آریائی منزل تک قریب ۱۷۰۰ سال کو محیط ہے وہیں دوسری جانب اس کے متن کے ذریعے سے ایران سے لے کر وسطی ہندوستان تک کی قدرتی خصائص کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔ ضبط تحریر میں آنے کے

---

[۴۵] ہسٹاریکل لنگوسٹکس: این انٹروڈکشن: وی۔ پی۔ لہمن، ص۔

[۴۶] مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خاں، ص۔ ۸

بعد ویدکی قدیم یا ابتدائی زبان کی نوعیت اور اس کی ارتقائی صورت سامنے آجاتی ہے۔ رگ وید کی زبان سادہ اور فطری تھی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہی زبان برہمنوں کے گھروں میں رائج تھی اس لئے اس کے بیشتر ابتدائی منتر سادہ اور غیر مصنوعی زبان میں ہی ہیں۔ بعد کے ویدوں کی زبان میں ادبیت پیدا ہونے لگی تھی۔

گذرتے وقت کے ساتھ آریا لوگ شمال مشرق تا مغرب کی جانب بڑھتے ہوئے رفتہ رفتہ ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں پھیل جاتے ہیں۔ یہ لوگ جیسے جیسے مختلف علاقوں میں پھیلتے گئے ویسے ویسے ایک منظّم معاشرے کی شکل اختیار کرتے گئے اور انہیں استحکام حاصل ہوتا گیا۔ ان کی زبان شمالی ہندوستان سے مشرق و مغرب بلکہ کسی نہ کسی طرح پورے ملک میں پھیل جاتی ہے اور اس پر علاقائی بولیوں کے اثرات مرتب ہونے لگتے ہیں۔ یہاں اس امر کی مزید وضاحت ضروری ہے کہ سنسکرت اور پراکرت دونوں ہی شکلوں میں آریائی زبانوں نے قبل مسیح صدیوں میں مہذب دراوریوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ نتیجتاً اس زبان کی مرکزیت ختم ہونے لگی۔ اس طرح سنسکرت کی تین علاقائی شکلوں ادیچیہ، مدھیہ دیش اور پراچیہ کا وجود ہوتا ہے۔ ادیچیہ قدیم ہندوستان کے شمال مغربی علاقے کی بولی تھی پراچے کا چلن مشرق میں تھا اور مدھیہ دیش ادیچیہ اور پراچے کے درمیانی خطے کی بولی تھی۔ ادیچیہ آریوں کی معیاری زبان سے قریب تر تھی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں یہی زبان زیادہ مستند اور کھری سمجھی جاتی تھی اور لوگ آریوں کی معیاری زبان کی سند اسی علاقے سے لیتے تھے۔ اس کے مقابلے میں مدھیہ دیس کی زبان کا معیار نسبتاً کم تھا۔ یہ نہ تو اتنی معیاری سمجھی جاتی تھی جتنی کہ شمال مغربی ہندوستان کی زبان اور نہ اتنی پست جتنی کہ مشرق (پراچے) کی۔ پراچے زبان کا چلن آریوں کے ان قبائل میں تھا جو مشرقی اتّر پردیش اور مغربی بہار نیز مشرقی ہندوستان کے بعض علاقوں میں آباد تھے۔ مغربی ہندوستان کے آریا ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس دور کے آخری ایام میں سنسکرت اپنا معیار کھونے لگی اور اس میں صرفی، صوتی اور نحوی اختلافات پیدا ہونے لگے۔ ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں بولی جانے لگیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عوام پراکرتوں کے طرف مائل ہونے لگے تھے۔ بالخصوص مشرقی ہندوستان کی ریاستوں

میں زبان کی ایسی تبدیلیاں زیادہ رونما ہونے لگیں۔ آریا انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے درمیان نسلی عصبیت بھی راہ پانے لگی تھی۔

آریا اپنے زبان کے معاملے میں بڑے حسّاس واقع ہوئے تھے۔ ان کے اندر اپنی زبان کو منظّم کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ اپنی زبان کا وقار بحال کرنے کی غرض سے وہ لوگ مدھیہ دیس کی زبان کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ساتھ ہی مقامی تعصّبات سے بالاتر ہو کر ہر علاقوں کے مخصوص الفاظ شامل کر کے ایک خاص قسم کی ٹکسالی زبان استعمال کرنے لگے۔ اب سنسکرت پورے ملک کی زبان بن گئی۔ مشرقی علاقوں کے عوام اگر چہ اس زبان میں گفتگو نہیں کر پاتے تھے مگر سمجھتے ضرور تھے۔ اس سلسلے میں ایک عظیم قواعد نویس پاننی کی کوششیں نا قابل فراموش ہیں۔ اس نے اس زبان کے کچھ اصول و قواعد مرتب کر کے ایک جامع تصنیف 'اشٹا ادھیائی' پیش کی۔ ان اصولوں کی پابندی اور دوسری جانب شائستہ اور بلیغ الفاظ کے انتخاب نے سنسکرت کو اور شستہ اور رفتہ بنا دیا۔ مذہبی پیشواؤں کی کوششوں نے بھی زبان کو منظّم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سنسکرت کا لفظ اسی شستہ و رفتہ زبان کے لئے بہ طور صفت استعمال ہونے لگا۔ مذہب، فلسفہ، تاریخی روایات، مذہبی قصوں اور داستانوں جیسے غیر آریائی عناصر کے اختیار کیے جانے کے بعد یہ ہندوستانی تہذیب کی علامت بن گئی۔ سنسکرت کے قدیم ڈرامے اور ان کے کرداروں کی بات چیت اس بات کی پختہ دلیل ہیں کہ یہ زبان اعلیٰ طبقوں میں مدت مدید تک بولی جاتی رہی۔ بلکہ اس زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جدید ہند آریائی زبانوں کے نشو نما کے بہت بعد تک قایم رہا۔

ملک کے جن حصوں میں آریا پھیل چکے تھے وہاں کے مذہبی، علمی اور ادبی طبقوں میں سنسکرت اچھی طرح سمجھی اور بولی جانے لگی۔ اس نے مذہب اور ادب کو اپنے آغوش میں جگہ دی اور شستہ اور بلیغ الفاظ سے اپنا خزانہ بھرا۔ نتیجتاً اس کا رشتہ عوام سے منقطع ہونے لگا اور یہ زبان اشراف و اعلی طبقہ کے لوگوں تک ہی سمٹ کر رہ گئی۔ لیکن تمام تر رعنائیوں اور مذہبی پیشواؤں اور اعلی و اشراف طبقہ کی پشت پناہیوں کے باوجود قواعد کے اصولوں نے اسے جکڑ کر محدود کر دیا۔ دوسری جانب اسی عہد میں دوسری زبانوں نے ویدک سنسکرت کا فطری رجحان اختیار کیا اس لیے وہ پراکرت یا فطری کہلانے لگیں۔ ویدک اور کلاسیکل

سنسکرت کی متذکرہ صورت حال مسعودِ حسین خاں کے الفاظ میں بہتر طریقے سے سمجھی جاسکتی ہے۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''سنسکرت رفتہ رفتہ ایک فرقہ کی زبان بن کر رہ گئی۔سنسکرت کے زوال کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ویدوں کی زبان تھوڑی بہت منظم ہونے کے باوجود اتنی ٹھس اور جامد نہیں تھی جتنی کہ ادبی سنسکرت۔ اپنی اہلیت کی وجہ سے اس نے 'دیوبانی' کا رتبہ تو پایا لیکن یہی 'امر پن' اس کے لیے بار بن گیا۔ادھر اس کی دوسری بہن جورانی نہ بن کر عوام کی گود میں پلی، جس نے آریوں کے علاوہ غیر آریوں کو بھی سمیٹا مروجہ زبان کی ماں بن بیٹھی''۔[۴۷]

یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ شروع سے ہی عوام کی ایک مخلوط زبان تھی۔ جسے آریوں کی ابتدائی زبان سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔بعض لوگوں نے اسی ابتدائی زبان کو ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت کی ماں تسلیم کیا ہے۔ویدک سنسکرت بھجنوں اور مذہبی نوعیت کی نظموں کی زبان تھی لیکن اس کے شانہ بہ شانہ عوام میں مختلف بولیاں بھی رائج تھیں۔ادبی سنسکرت بھی انہیں بولیوں میں ایک تھی۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہند آریائی کے اس ابتدائی دور میں سنسکرت کی ابتدائی شکل ایک پراکرت کی ہی تھی اور اس کے علاوہ بھی پراکرتیں رائج تھیں۔ویدی سنسکرت ویدوں اور کلاسیکل سنسکرت ادبی تصانیف میں محفوظ رہیں لیکن دوسری پراکرتیں شاید مناسب وسیلہ نہیں ملنے کی وجہ سے معدوم ہوگئیں۔یعنی سنسکرت ویدک عہد کی ایسی پراکرت ہے جس نے مذہبی، علمی اور ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی جو دوسری پراکرتوں کو حاصل نہیں ہوسکی۔اس طرح سنسکرت خواص کی تہذیب یافتہ زبان بن گئی اور پراکرتیں عوام کی فطری بولیوں کی حیثیت سے رائج رہیں۔سنسکرت دنیا کا عظیم الشان تہذیبی سرمایہ بن گئی اور دوسری پراکرتیں کوئی اہمیت حاصل نہیں کرسکیں۔لیکن لسانیات کا ایک اصول ہے کہ جب ایک زبان مردہ ہوجاتی

---

[۴۷] مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خاں، ص۔۱۴،۱۵

ہے تو اسی وقت دوسری زبان کا نشونما ہوتا ہے۔ یعنی سنسکرت ایک جانب زوال پذیر ہوتی ہے تو پراکرتیں اپنا سر اٹھاتی ہیں۔ پراکرتوں کے وجود کے متعلق علما میں خاصا اختلاف ہے۔ کسی کا ماننا ہے کے پراکرتیں براہ راست سنسکرت سے پیدا ہوئیں ہیں، تو کسی کا خیال ہے کہ پراکرت کی حیثیت یکسر علاحدہ ہے، بس اس نے سنسکرت کا اثر قبول کیا ہے۔ احتشام حسین کے مطابق:

> ''بہت سے لوگ پراکرتوں کو سنسکرت سے ماخوذ سمجھتے ہیں لیکن یہ خیال زیادہ صحیح نہیں ہے بلکہ صرف اس حد تک درست ہے کہ قدیم اور وسطی پراکرتوں اور جدید دور کی زبانوں پر سنسکرت نے زبردست اثر ڈالا۔'' ۴۸؎

لیکن مرزا خلیل احمد بیگ کافی وضاحت کے ساتھ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ:

> ''یہ بات قابل ذکر ہے کہ 'پراکرت' کوئی علاحدہ زبان نہیں تھی، بلکہ سنسکرت کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ سنسکرت کی ہی کوکھ سے پیدا ہوئی تھی.... یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کوئی بھی زبان خلا میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ ہر زبان کا کوئی نہ کوئی ماخذ اور منبع ضرور ہوتا ہے جس سے یہ ارتقا پاتی ہے۔ 'پراکرت' کا ماخذ و منبع بھی سنسکرت زبان ہی ہے۔'' ۴۹؎

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ پراکرتوں کے نشونما کے زمانے میں ادبی سنسکرت عوام میں رائج تھی اور اس عہد میں تصنیف و تالیف کا ذریعہ تھی لیکن کیا پراکرتیں اسی ادبی سنسکرت کے بطن سے وجود میں آئیں یہ مسئلہ ذرا توجہ طلب ہے۔ اردو کی بیشتر لسانی تاریخ میں باتیں یا تو اتنی علمی، پیچیدہ اور مبہم یا پھر اتنی سرسری، عام اور سطحی ہوتی ہیں کہ ان کی روشنی میں زبانوں اور بولیوں کے درمیان خط امتیاز کھینچنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے اور ان کی تاریخ کا تصور واضح نہیں ہو پاتا۔ مسعود حسین خاں نے اپنی تصنیف ''مقدمہ تاریخ زبان اردو''

---

۴۸؎ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ: احتشام حسین، ص۔۳۴

۴۹؎ اردو کی لسانی تشکیل: مرزا خلیل احمد بیگ، ص۔۲۲۹

میں اس عہد کی زبانوں اور بولیوں کا جو خاکہ کھینچا ہے اس کو یہاں پیش نظر رکھنا مناسب ہوگا تاکہ ہند آریائی کی ابتدائی اور وسطی عہد کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھ سکیں۔

جیسا کے سطور بالا میں عرض کیا جاچکا کہ ابتدا میں عوام کی ایک مخلوط زبان تھی جس سے ویدک اور کلاسیکل سنسکرت ارتقا پذیر ہوئی ہیں۔ وہ مخلوط زبان ابتدائی سنسکرت تھی جو دو حیثیتوں سے ارتقا پذیر تھی ادبی سنسکرت نے صرف چنے ہوئے اور بلیغ الفاظ سے اپنا خزانہ بھرا اس پر مستزاد یہ کہ عوام کے ایک مخصوص طبقہ کی نمائندہ بن گئی۔ یوں تو پہلی صدی عیسوی کے ڈرامے شاہد ہیں کہ ادبی سنسکرت تصنیف و تالیف کے علاوہ اس عہد میں عوام کی بول چال کی زبان کی حیثیت سے بھی رائج تھی۔ بعد میں یہی علمی، ادبی اور مذہبی موضوعات کا وسیلہ بنی اور اس کا رشتہ آریوں کے اعلیٰ طبقوں سے جڑ گیا۔ اس طرح سنسکرت رفتہ رفتہ ایک فرقہ کی زبان بن کر رہ گئی نتیجتاً عوام سے دور ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف ویدک سنسکرت نے اپنا فطری رجحان برقرار رکھا اور وہ ہر لحظہ پھیلتی گئی، عوام سے قریب رہی اور علاقائی بولیوں پر اس کے اثرات مرتسم ہوتے رہے۔ ادبی سنسکرت کے محدود ہو جانے کے بعد لامحالہ عوام نے علاقائی بولیوں کو اختیار کیا۔ یہ فطری بولیاں تھیں جو زبان کی تاریخ میں پراکرت کہلائیں۔ پراکرتوں یا موجودہ زبان سے متعلق مسعود حسین خاں کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں:

> ''زبان کا جو دھارا آریوں کے وقت سے بہنا شروع ہوتا ہے اس کی ایک شاخ جھیل کی شکل اختیار کر لیتی ہے، حسین لیکن محدود، جسے ہم سنسکرت کہتے ہیں۔ اس دھارے کی دوسری شاخ مختلف روپ بدلتی ہوئی اب تک بہہ رہی ہے۔ کبھی گدلی، کبھی تابناک، لیکن ہر لحظہ پھیلتی ہوئی۔ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کا تعلق براہ راست دھارے کی اسی شاخ سے ہے۔ مختصر یہ کہ آریوں کی ابتدائی زبان سے ہی ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت پیدا ہوئیں۔'' [۵۰]

---

[۵۰] مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خاں، ص۔۱۵

مسعود حسین خاں کے مطابق پراکرتوں کا وجود ادبی سنسکرت سے نہیں بلکہ اس ابتدائی زبان سے ہوتا ہے جس سے ویدک اور ادبی سنسکرت بھی وابستہ ہیں۔ اس طرح پراکرتوں کے وجود پذیر ہونے اور ان کے نشو نما کے ساتھ ساتھ ہم ہند آریائی کے وسطی عہد میں داخل ہو جاتے ہیں۔

☆ وسطی ہند آریائی عہد

ہم دیکھتے ہیں کہ ہند آریائی کا عہد قدیم سنسکرت کے عروج کا زمانہ تھا۔ وسطی ہند آریائی میں بھی سنسکرت ہی موثر زبان کی حیثیت سے پیش پیش نظر آتی ہے۔ ہند آریائی زبانیں علاقائی بولیوں کی حیثیت سے بھی ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن اس سے سنسکرت کے وقار پر کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اس کی حیثیت اور بھی شستہ ورفتہ زبان کی ہو جاتی ہے اور اس کی جڑیں اور بھی مظبوط ہونے لگتی ہیں۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب سنسکرت کی حیثیت ایک ٹکسالی زبان کی ہو جاتی ہے اور صرف ونحو میں قید ہو کر صرف بناوٹی زبان رہ جاتی ہے۔ ایس میں سنسکرت کا ارتقاء بالکل رک جاتا ہے اور یہ زبان ایک طرح سے جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔ لامحالہ عوامی بولیوں کی ترقی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ ساس ضمن میں سنیتی کمار چٹر جی کا لکھتے ہیں:

> ''سنسکرت کے بعد وہ زبانیں آئیں جنہیں علمی انداز سے دور جائے بغیر نئ شکلیں کہا جا سکتا ہے یعنی قدیم پراکرتیں اور جدید بھاشا۔ یہاں مختلف بولیاں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں ...... سنسکرت اور پراکرت ایک دوسرے سے جدا نہیں کی جا سکتی تھیں۔ دونوں میں سے کسی کے بارے میں نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ ایک دوسرے سے آزاد وجود رکھتی ہیں ان میں باہمی گہرا تعلق تھا۔''[۵۱]

سنسکرت کے منظّم اور محدود ہوتے ہی عوام کی بول چال کی فطری زبان سنسکرت کی ڈگر سے یکسر مختلف ہوگئی اور یہ بولیاں اپنا حلقۂ اثر وسیع کرنے لگیں۔ ان بولیوں کا ارتقاء پراکرتوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ انہیں عوام میں مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور بہت جلد یہ عام بول چال کی زبان بن جاتی ہے۔ پورے

---

۵۱ ہندی اور ہند آریائی: سنیتی کمار چٹر جی، ص۔ ۷٦

ہندوستان میں پراکرتوں کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ پراکرت دراصل کوئی علاحدہ زبان نہیں تھی بلکہ سنسکرت زبان میں ہی تبدیلی رونما ہونے سے وجود میں آئی تھی۔ جب سنسکرت زبان کے تلفظ قواعد اور نحوی ڈھانچے میں کافی حد تک تبدیلیاں ہوگئیں تو یہ زبان بالکل بدل گئی اور سنسکرت کی یہی بدلی ہوئی شکل پراکرت کہلانے لگی۔ پراکرتوں کی ابتدا سے ہی ہند آریائی تاریخ کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم اسے وسطی ہند آریائی کا زمانہ بھی کہتے ہیں جو ۱۵۰۰ سال یعنی ۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اسے لسانیات کے ماہرین نے تین ادوار میں منقسم کیا ہے۔ اس دور میں عوام کے درمیان تین طرح کی پراکرتیں نظر آتی ہیں۔ ہر پراکرت کا زمانہ پانچ سو سال پر محیط ہے۔

۱۔ پہلی پراکرت

۲۔ دوسری پراکرت

۳۔ تیسری پراکرت

پہلی پراکرت یعنی ابتدائی پراکرت، اس کا زمانہ تقریباً ۵۰۰ قبل مسیح کا ہے۔ اس کا تعین ۵۰۰ ق۔م تا ۱۰۰ سنہ عیسوی کیا گیا ہے۔ اس میں پالی اور اشوک کے کتبوں کی زبان کا شمار ہوتا ہے۔ یہ دونوں پراکرت کی اولین شکلیں ہیں جو عوام میں رائج تھیں۔ ہندوستانی تمدن کی تاریخ بودھ اور جین مذہب کی شکل میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوتا ہے۔ دونوں مذہبی پیشواؤں نے اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ اپنی مقامی بولیوں میں کی۔ مہاتمابدھ (۵۶۳ تا ۴۸۳ ق م) نے تو رشد و ہدایت اور تلقین کے لیے شدت کے ساتھ علاقائی زبان یعنی پالی ہی اختیار کی۔ اسی زمانہ میں مہاتمابدھ کے دو شاگردوں نے سے یہ اجازت طلب کی کہ اگر آپ حکم دیں تو آپ کے اقوال شستہ و رفتہ اور اس وقت کی مہذب زبان ''سنسکرت'' میں قلم بند کر دیے جائیں۔ لیکن مہاتما نے ایسا کرنے سے سختی سے منع فرمایا اور عوامی زبان کو ترجیح دی۔ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کے معتقدین نے بھی اسی پالی زبان کو وسیلہ بنایا۔ نتیجتاً سنسکرت زبان کی طرح پراکرت کو بھی ایک مقدس زبان کا رتبہ حاصل ہوگیا۔ اس طرح مذہب کا سہارا ملتے ہی علاقائی بولیاں چمک اٹھیں۔ اور وسطی ہند آریائی کے اس دور میں سب سے اہم زبان پالی بن گئی جو بودھی عقیدے اور ادب کے

ساتھ نہ صرف پورے ہندوستان میں پھیلی بلکہ اس نے بودھ بھکشوؤں کے ساتھ بیرون ہندوستان کا بھی سفر کیا۔ عام طور پہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پالی کا تعلق مگدھ دیس کی زبان سے ہے مگر حقیقت کچھ اور بھی ہے۔ پالی مگدھ دیس کی رائج زبان تھی اور مذہب کا سہارا پاکر ہندوستان کے دور دراز علاقے مثلاً شمال مغرب کے قدیم علمی مرکز تکشلا کے علاوہ بدھ بھکشوؤں کے ساتھ دیگر ممالک تک پہنچ گئی۔ اس کا متبادل نام ''ماگدھی بھاشا'' ہے۔ اس کا تعلق وسطی ہند یعنی شورسین کے علاقے کی زبان سے ہے۔ بودھوں کی مذہبی کتابیں پالی زبان میں ہی محفوظ ہیں اور اس متن کے ذریعے اس کے نمونے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ پالی ابتدائی پراکرت کی پہلی شکل تھی اور چونکہ عوام میں رائج بولی یہی تھی اس لئے یہ پہلی پراکرت کہلائی۔ پہلی پراکرت کے اندر زبان کے دو طرح کے نمونے نظر آتے ہیں۔ اس کی پہلی صورت پالی اور دوسری اشوک کے کتبوں اور لاٹوں کی زبان تھی۔

پہلی پراکرت کی دوسری شکل اشوک (۲۷۳ تا ۲۳۲ ق م) کے لاٹوں اور کتبوں کی زبان میں نظر آتی ہے۔ یہ اشوک کی درباری زبان تھی جس کی اساس مشرقی بولی پہ تھی۔ سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے اس نے دوسری بولیوں کو خوب متاثر کیا۔ اشوک مہاتما بدھ کے سوا دو سو سال بعد ایک عظیم حکمراں ہونے کے ساتھ ساتھ بدھ مذہب کا پیرو بھی تھا۔ وہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں پہلا شہنشاہ تھا جس نے اپنے کتبوں کے ذریعے سے اپنی رعایا سے خطاب کیا ہے۔ پتھروں پر کھدے ہوئے اس کے سیاسی اصولوں اور مہاتما بدھ کے تعلیمات ہندوستان، پاکستان اور افغانستان کے ۴۵ مختلف جگہوں میں پائے گئے ہیں جن کی مجموعی تعداد ۱۸۱ ہے۔ ان کتبوں اور لاٹوں کی تاریخی اہمیت کے علاوہ لسانی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔ ان پر کندہ تحریروں سے پتہ چلتا ہے کے پہلی پراکرت میں پالی کے علاوہ اس کی دوسری شکل تھی جو ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور نیپال کے بڑے طول و عرض پر مختلف رسم الخط میں موجود ہے۔ اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں بے حد آسانی ہوتی ہے کہ وسطی ہند آریائی کے ابتدائی عہد میں کس طرح کی بولیاں اور زبانیں رائج تھیں۔ یہ کتبے عام فہم اور سادہ زبان میں لکھوائے گئے تھے کیوں کہ ان کا مقصد اپنی بات عوام تک پہنچانے سے تھا۔ ایک علاقے کے کتبے کی زبان دوسرے سے مختلف ہے یعنی ان میں علاقائی فرق واضح

طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اشوک کے کتبے تین طرح کی علاقائی بولیوں اول شمال مغربی پراکرت (شہباز گڑھی اور مانسہرا کے کتبات) سے دوم جنوب مغربی گرنار اور سارناتھ کے کتبات مشرقی علاقے یعنی پراچے کی نمایندگی کرتے ہیں۔

دوسری پراکرت میں ادبی پراکرت کا شمار ہوتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ زبان خلاء میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ کسی زبان کا بگڑنا ہی دوسری نئی زبان کے بننے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی زبان کی ابتدا، ارتقا اور زوال کی تاریخ ہوتی ہے۔ بقول مسعود حسین خاں:

> ''پہلی اور دوسری پراکرت میں حد فاصل قائم کرنا دشوار ہے کیوں کہ دوسری پراکرت کے ابتدائی حالات کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ پالی کے اندر ہی ہمیں اس کی شکل دکھائی دیتی ہے''۔[۵۲]

پالی نے ترقی کر کے جب ایسی شکل اختیار کر لی کہ اس میں ادبی اسالیب کی گنجائش پیدا سکے تو اس زبان میں ادب تخلیق ہونے لگا اور پھر اسے ادبی پراکرت کا درجہ حاصل ہو گیا۔ وسطی ہند آریائی کی پراکرتوں کا یہ دوسرا عہد ۱۰۰ سنہ عیسوی سے ۵۰۰ سنہ عیسوی کو محیط ہے۔ اس طرح پراکرتیں جو عوامی بولیوں کی حیثیت رکھتی تھیں اب ادبی زبان بن گئیں۔ اپنے عہد سے پیشتر کی زبانوں کی طرح پراکرتیں بھی علاقائی سطح پہ سر اٹھانے لگیں اور انہیں ان کے علاقے سے موسوم کیا جانے لگا۔

علاقائی اعتبار سے پراکرتوں کے تفصیلی بیان سے پیشتر اس حقیقت کا ذکر ضروری ہے کہ ہند آریائی زبانوں کے ہر عہد کے نمونوں کو اگر سامنے رکھ کر ان کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ان کی بتدریج تبدیلیوں میں موجودہ زبان کا ارتقا صاف طور پر نظر آئے گا۔ بیشتر ماہرین زبان نے ایسے تبدیل شدہ الفاظ کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے۔ مثال کے طور پر 'پتر' سنسکرت کا لفظ ہے پراکرت میں اس کا تلفظ مشدد طریقے سے 'پتّ' بولا جاتا تھا۔ جدید ہندوستانی میں وہی لفظ 'پتر' بہ معنی بیٹا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی سنسکرت کا 'دگدھ' پراکرت میں 'ددّھ' ہو جاتا ہے اور اب اس کے لیے لفظ 'دودھ' مستعمل ہے۔

---

[۵۲] مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خاں، ص۔ ۲۰

(۱) شورسینی پراکرت ۔شورسینی پراکرت جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق شورسین یعنی متھرا کے علاقے سے تھا۔قدیم ہند آریائی عہد میں یہ علاقہ 'مدھیہ دیشہ' کہلاتا تھا۔ یہ سنسکرت سے سب سے زیادہ قریب تھی اور لسانی اعتبار سے اس پر سنسکرت کے گہرے اثرات تھے ۔سنسکرت ڈراموں میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا اور سنسکرت کے بعد اسے وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

(۲) ماگدھی پراکرت ۔ یہ بنیادی طور پر مگدھ کے علاقے کی زبان تھی جو اب جنوبی بہار کا حصہ ہے۔ یہ قدیم ہند آریائی کے 'پراچیہ' کی بولیوں کا علاقہ ہے۔آریوں کے مرکز سے کافی دور ہونے کی وجہ سے ابتدا سے ہی اس علاقے کی زبانیں ادیچیہ کے معیار پر کھری نہیں اترتیں تھیں ۔آریوں کی زبان میں صوتی اور لفظی سطح پر تبدیلی یا بگاڑ کا عمل سب سے پہلے اسی علاقے میں رونما ہوتا تھا۔اس پراکرت کا استعمال سنسکرت ڈراموں کے نچلے طبقے کے کرداروں کی زبان سے ادا کرایا جاتا تھا۔اس عمل سے اس علاقے کی زبان اور بولیوں کے معیار کا پتہ چلتا ہے۔

(۳) اردھ ماگدھی پراکرت ۔شورسینی پراکرت اور ماگدھی پراکرت کے درمیان کا علاقہ اردھ ماگدھی پراکرت کا علاقہ تھا۔ بحیثیت مجموعی یہ بہار اور لکھنؤ کے بیچ کی زبان تھی ۔ اس پراکرت نے جین مذہب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔جین مذہب کی ابتدائی مذہبی تصانیف اسی زبان میں پائی جاتی ہیں۔مہاویر جین نے جس زبان میں جین مذہب کی تبلیغ واشاعت کی وہ اردھ ماگدھی کی قدیم شکل تھی ۔ یہ ایک ترقی یافتہ اور مہذب زبان تھی۔

(۴) مہاراشٹری پراکرت ۔ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے کے یہ مہاراشٹر کی پراکرت تھی اور تمام پراکرتوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔قواعد نویسوں نے اسے 'مثالی پراکرت' کہا ہے۔ان میں بیشتر کی توجہ کا مرکز یہی پراکرت تھی ۔انہوں نے اس کا مطالعہ کافی تفصیل سے کیا۔سنسکرت ڈراموں میں پراکرت کے نثری اجزا اسی پراکرت کے پائے جاتے ہیں ۔اس دور کی بیشتر ادبی تصانیف اسی ہراکرت میں ملتی ہیں ۔اس کا استعمال موسیقی میں بھی کیا جاتا تھا۔

(۵) پیشاچی پراکرت ۔ پیشاچی ہراکرت پنجاب اور کشمیر میں بولی جاتی تھی ۔اس میں ادبی

تصانیف بہت کم ملتی ہیں۔اس کے متعلق علما کا یہ ماننا ہے کہ یہ خالص ہند آریائی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں ایرانی زبانوں کے بعض اثرات نفوذ کر گئے ہیں۔

ادبی پراکرتیں جب اپنی ارتقا کی بلندیوں پر پہنچ کر زوال آمادہ ہوئیں تو انہیں کے بطن سے 'اپ بھرنشیں' پیدا ہوئیں۔ یہ پراکرت کی تیسری قسم تھی جو ادبی پراکرتوں کی ہی طرح کم سے کم پانچ اہم صورتوں میں پورے ہندوستان میں بولی جاتی تھی۔لیکن ان پانچ اہم علاقوں کے علاوہ بھی اس زبان میں تخلیقات وجود میں آئیں۔اپ بھرنشوں کا ارتقاء ۵۰۰ صدی عیسوی سے لے کر ۱۰۰۰ سنہ عیسوی تک ہوتا ہے۔ یہ وسطی ہند آریائی عہد کا آخری دور ہے۔اپ بھرنش کے لغوی معنی بھرشٹ (Corrupt) کے ہیں۔کسی ترقی یافتہ زبان کی بگڑی ہوئی شکل کو اصطلاح میں 'اپ بھرنش' کہا جاتا ہے۔ پاتنجلی جو اپنے عہد کا ممتاز قواعد نویس ہے اس نے اس اصطلاح کا استعمال ایسے الفاظ کے سلسلے میں کیا ہے جو تلفظ کے اعتبار سے بگڑ گئے تھے یا جن کی صوتی ہیئت مسخ ہو گئی تھی۔ دوسری پراکرتیں جب ادبی صورت اختیار کر گئیں تو ان کا ارتقاء مختلف نہج پہ ہونے لگا اور عوام سے ان کا رشتہ ختم ہو گیا۔عوام کی زبان دوسری ڈگر پر ارتقا پانے لگی۔اس نے پراکرت کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر اور ان کی شکلیں بگاڑ کر بولنا شروع کر دیا یہی ٹوٹی پھوٹی اور بگڑی ہوئی زبان اپ بھرنش کہلائی۔

☆ جدید ہند آریائی عہد میں مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کا لسانی ارتقا:

دوسرے دور کے اختتام یعنی تقریباً ۱۰۰۰ عیسوی میں جب 'اپ بھرنشیں' بھی زوال آمادہ ہوئیں تو تیسرے دور 'جدید ہند آریائی' کا آغاز ہوتا ہے۔اس کا زمانہ ۱۰۰۰ء تا حال تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس عہد میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر تیزی کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ان تبدیلیوں کا اثر زبانوں اور بولیوں پر پڑنا لازمی تھا۔اس زمانہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ہوتی ہے جن میں ترک، افغان اور ایرانی شامل ہیں۔ان کی حکومت کا بہت بڑا عملہ تھا۔ وہ اپنی زبان بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے اور ان کی تہذیب بھی یہاں سے مختلف تھی۔ چونکہ یہ قومیں ایک فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں وارد ہوئیں اور یہاں قیام کیا۔اس لئے شاید یہاں کے مقامی باشندوں نے

ان سے اختلاط بڑھانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ایک دوسرے کے باہم تعلقات سے ایک نئی اور مشترکہ تہذیب پروان چڑھنے لگی۔ان نو واردوں کی اپنی زبان ترکی، فارسی اور عربی تھی۔ان زبانوں کا شمالی ہند کی بولیوں پر اثرات کا مرتب ہونا لازمی تھا۔اس طرح جدید ہند آریائی زبانوں میں ان غیر ملکی زبان کے الفاظ کی مداخلت نے ہندوستانی زبان کے ارتقا کی رفتار تیز کر دی۔اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ ان اثرات سے ایک نئی زبان پیدا ہو گئی بلکہ پہلے سے موجود زبان کے لیے ارتقا کی مزید راہیں ہموار ہو گئیں۔گریرسن نے اپنی کتاب ''لنگوسٹک سروے آف انڈیا'' جو اس کا ایک بڑا کارنامہ ہے اس میں جدید ہند آریائی بولیوں کا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے۔اس کے مطابق شمالی ہند کا وہ علاقہ جو کبھی خاص سنسکرت کا حلقۂ اثر تھا اور مدھیہ دیش کے نام سے ذکر ملتا ہے موجودہ مغربی اتر پردیش وہی ہے۔اس لیے اس نے اس علاقے کی زبان کو ''مغربی ہندی'' کا نام دیا اور مزید اس کے اندر پانچ بولیوں ہندوستانی، بانگرو، برج، قنوجی اور بندیلی کے حدود اربعہ کی نشاندہی کی ہے۔[۵۳] ہندوستانی جسے کھڑی کہا جاتا ہے روہیل کھنڈ کے علاقے کی بولی ہے یعنی موجودہ سہارن پور میرٹھ وغیرہ کے اضلاع کی بولی۔گریرسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ زبان مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گئی۔اس طرح زبانوں کی انہیں کسی ایک ترقی یافتہ شکل نے اردو کی صورت اختیار کر لی جس کی نشاندہی اس کی مماثلتوں کی بنا پر بعد میں کھڑی بولی کی شکل میں کی گئی۔اس میں کئی زبانوں کے الفاظ مثلاً فارسی، عربی، ترکی اور علاقائی زبانیں شامل ہیں لیکن اس کی اصل ساخت کا خمیر مغربی ہندی کی کھڑی بولی سے تیار ہوا ہے۔بلکہ علماء اس رائے سے متفق ہیں کہ کھڑی بولی ہی کی ترقی یافتہ شکل اردو زبان ہے۔

مذکورہ تمام گفتگو کی روشنی میں مجموعی طور پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے جس کا براہ راست تعلق زبانوں کے ہند یورپی خاندانوں سے ہے۔ہندوستان میں اس زبان کی مکمل لسانی تاریخ ہند آریائی کی شکل میں لگ بھگ ساڑھے تین ہزار سال پر پھیلی ہوئی ہے۔اس کی ساخت کھڑی بولی پر مشتمل ہے۔کھڑی بولی کا ارتقا شورسینی اپ بھرنش کی مغربی ہندی سے ہوا ہے۔شورسینی اپ

---

۵۳ لنگوسٹک سروے آف انڈیا : جی۔اے۔گریرسن، جلد۔۹، حصہ۔اول، ص۔۲

# باب سوم

## اردو کی لسانی تاریخیں: انیسویں صدی میں

اردو زبان کی لسانی تاریخوں سے میری مراد ان تصانیف سے ہے جن میں اردو زبان کی ابتدا اور ارتقاء کی مربوط اور مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ عام طور پر جب ہم اردو زبان کی تاریخ یا اس کی لسانی تاریخ کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس موضوع سے متعلق ایک جامع اور مدلل کتاب کا تصور قائم ہوتا ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ کوئی بھی خیال یا تصور خلا میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے وجود پذیر ہونے کے کچھ اسباب وعوامل ضرور ہوتے ہیں۔ اس خیال کی روشنی میں یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی بھی موضوع پر اس سے متعلق کوئی مکمل تصنیف اچانک منظر عام پر آ جاتی ہے، یا اس سے قبل اس کے کچھ خیمہ یا اسباب ومحرکات بھی ہوتے ہیں؟ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی علم خواہ وہ فلسفہ ہو یا سائنس ایک حتمی اور مکمل شکل اختیار کرنے میں اسے کئی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ اردو زبان سے متعلق مباحث اور تاریخ نویسی کی داستان بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اردو زبان پر کسی باقاعدہ تصنیف سے بہت پہلے جستہ جستہ کچھ نثر پارے اور تحریریں موجود تھیں۔ اس ضمن میں میر امن دہلوی کی تصنیف ''باغ وبہار'' کا مقدمہ، سید انشاء کی ''دریائے لطافت'' کا دیباچہ اور سرسید، امام بخش صہبائی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، شمس اللہ قادری اور ان جیسے دیگر علماء کی تحریروں میں اردو زبان کی ابتدا اور تاریخ پر ضمناً اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس نوع کی تحریریں آگے چل کر اردو زبان کی تاریخ نویسی میں زبان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے محرک ثابت ہوئیں۔ اردو زبان کی تاریخ سے متعلق اس موضوع پر آج ہمارے سامنے جو کچھ موجود ہے وہ ان صاحبان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو زبان کی باضابطہ تاریخ نویسی پر قلم اٹھانے کی تحریک ایسے نثر پاروں اور مضامین سے ہی ملی ہوگی۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی نقوش کی حیثیت سے اردو کی لسانی تاریخوں کے سلسلے میں ان دیباچوں، مقدموں اور نثر پاروں کو بھی موضوع بحث بنایا جائے۔ کیوں کہ یہی نثر پارے اور تحریریں اردو زبان کی تاریخ نویسی کو اساس فراہم کرتی ہیں۔

اردو زبان کے اوپر لکھی گئی ایسی تحریروں اور تصانیف کو ہم کم از کم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ قریب دوسو سال یعنی انیسویں اور بیسویں صدی کو محیط ہیں۔اس کی پہلی قسم ان نثر پاروں کی ہے جن کی جانب مندرجہ بالا سطور میں اشارہ کیا گیا۔ان نثر پاروں کی نوعیت کسی بالا رادہ تحریر یا باضابطہ کتاب کی نہیں ہے بلکہ انہیں ایک عمومی اظہار خیال کا نام دیا جا سکتا ہے۔اس فہرست میں چند علماء کے خیالات مثلاً میر امن کی تصنیف ''باغ و بہار'' کا مقدمہ یا انشااللہ خان انشاء کی ''دریائے لطافت'' کا دیباچہ اور سرسید، امام بخش صہبائی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد جیسے علماء کی تحریریں شامل ہیں۔ان حضرات کی تصانیف مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ان میں کسی کا موضوع اردو صرف ونحو اور قواعد ہے تو کسی کا اردو شعراء کا تذکرہ۔لیکن یہ بھی ایک کارآمد آغاز تھا کہ ان صاحبان نے اپنی کتاب کے ابتدائی حصے میں ایسے خیالات کو جگہ دی اور اردو زبان کے آغاز اور ارتقاء پر سرسری طور پر اظہار خیال کیا۔اس نوع کی دوسری اور تیسری قسمیں بیسویں صدی میں ملتی ہیں۔ یہ تحریریں یا تصانیف باضابطہ طور پر کتابی شکل میں شائع کی گئیں۔ان کتابوں کا شمار خصوصی طور پر اردو زبان کی تاریخوں کے ضمن میں ہوتا ہے۔لیکن ان میں سے بعض علماء علم اللسان سے نابلد ہی نہیں تھے بلکہ لسانیات کا وہ کوئی شعور بھی نہیں کر سکتے تھے اور اگر تھوڑا بہت شعور بھی رکھتے تھے تو وہ اتنا نہیں تھا کہ یہ حضرات اس موضوع سے انصاف کر سکتے۔ان لوگوں نے اردو کی ابتداء، جائے پیدائش اور ارتقاء کی تاریخ کے چند مفروضے قائم کیے اور ان کے جواز میں نیم عقلی دلائل پیش کیے اور اس کی روشنی میں ایسی تاریخیں متعین کی جو بعد میں لسانیاتی رو سے غلط ثابت ہوئیں۔لیکن مذکورہ خیال کا اطلاق صرف نظریات کی حد تک ہی ممکن ہے۔ ورنہ یہ کتابیں جس زمانے میں لکھی گئی تھیں اپنے موضوع کے اعتبار سے نہ صرف اہم تھیں بلکہ ان میں پیش کیا گیا مواد آج بھی لسانیات کے ایک طالب علم کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ان سے کسب فیض اور استفادہ کیے بغیر کوئی بھی طالب علم اپنے ذہن کی تربیت نہیں کر سکتا ہے۔اردو زبان کی تاریخوں کے سلسلے میں ان تحریروں کا ذکر ناگزیر ہے۔آج ان کتابوں کے ذکر کے بغیر اردو زبان کی تاریخوں کی فہرست نامکمل ہوگی۔اس لئے ان کتابوں کو ہم ثانوی حوالے کے خانے میں رکھ سکتے ہیں۔

واضح رہے کہ دن بہ دن علم اور تحقیق کے فروغ کے ساتھ کسی بھی موضوع کا تاریک پہلو روشن ہو کر سامنے آرہا ہے۔ عہد حاضر میں جدید لسانیات نے اردو کی لسانی تاریخوں سے متعلق غیر معتبر مفروضوں کو رد کر دیا ہے ۔ جدید لسانیات میں زبان کا سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہاں مفروضوں اور قیاس آرائیوں کے بجائے حقیقت، معروضیت اور استدلال سے کام لیا جاتا ہے۔ ہمارے بعض علماء نے زبانوں کا بالعموم اور اردو زبان کا بالخصوص غائر مطالعہ کیا اور اس کی اصل اور ابتدائی تاریخ کا سراغ لگایا۔ نئے انکشافات اور تحقیقات نے اس موضوع سے متعلق بیشتر غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے ۔ اس علم کی روشنی سے استفادہ کر کے اردو زبان کی تاریخ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں پیش کی گئیں ۔ اور اس طرح جو کتابیں منظر عام پر آئیں وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے مستند اور معتبر قرار دی گئیں ۔ آج اردو زبان کی تسلیم شدہ تاریخ انہیں تصانیف میں پیش کیے گئے خیالات پر مبنی ہے اور لسانی شہادتوں اور دلائل کی روشنی میں جامع و مدلل سمجھی جاتی ہے۔ انہیں ہم اس نوعیت کی تیسرے خانے میں جگہ دے سکتے ہیں ۔ ان کتابوں کے مصنف ایسے علماء ہیں جو صرف اردو زبان ہی نہیں بلکہ مختلف زبانوں کی باریکیوں سے بھی واقف ہیں ۔ ان حضرات نے اس موضوع پر خاطر خواہ توجہ صرف کی اور زبان کی تاریخ کا تاریک پہلو روشن کیا ہے۔

آخر میں اس نوعیت کی ایک اور زمرے کا ذکر ضروری ہے جو ان مضامین یا تصانیف پر مشتمل ہے جو باضابطہ طور پر انگریزی زبان میں منظر عام پر آئیں ۔ مثال کے طور پر ان میں چند اہم تصانیف اور ماہرین کے نام یوں پیش کیے جا سکتے ہیں جیسے جان ابراہم گریرسن کی ''لنگوسٹک سروے آف انڈیا'' یہ ہندوستانی لسانیات کا ایک عظیم کارنامہ ہے، جان بیمز کی ''این آؤٹ لائن آف اندین فلالوجی'' جس کا ترجمہ سید احتشام حسین نے کیا اور ایک بسیط مقدمے کے ساتھ اسے ۱۹۴۸ء میں شایع کیا۔ ان کے علاوہ جولس بلاک، پروفیسر ٹرنر، ڈاکٹر گراہم بیلی، گلکرسٹ، اسپرنگر اور گارساں دتاسی وغیرہ کے نام اہم ہیں ۔ حالاں کہ ان تصانیف یا ان علماء کے خیالات کا ہمارے موضوع سے براہ راست کوئی علاقہ نہیں ہے اور یہ بنیادی دائرہ کار سے باہر کی چیزیں ہیں پھر بھی ان کے ذکر کے بغیر اس موضوع سے انصاف ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ایسی تحریروں اور تصانیف کو ہم چوتھی قسم میں رکھ سکتے ہیں ۔

اردو زبان پر لکھی گئی تحریروں اور کتابوں کی متذکرہ تقسیم محض آسانی کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ ان میں ہر تحریر یا نثر پارے اور تصنیف کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہاں اس بحث کے تحت ہمیں صرف ان نثری ٹکڑوں یا تحریروں سے مطلب ہے جو اردو میں اردو زبان کے متعلق بحیثیت ابتدائی نقوش کے تسلیم کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے یہاں ان نظریات پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی تا کہ ان نثر پاروں کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکے اور ان کی قدر و قیمت کا تعین ممکن ہو۔ اس لئے کہ مواد کے اعتبار سے ہمارے یہاں میر امن کی کتاب ''باغ و بہار'' مطبوعہ ۱۸۰۲ء سے لے کر سید سلیمان ندوی کی ''نقوش سلیمانی'' ۱۹۳۹ء تک میں پیش کیے گئے خیالات کا ایک سلسلہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ اس نوعیت کی متعدد تحریریں ہیں جو زمانی اعتبار سے تقریباً ڈیڑھ سو سال کو محیط ہیں۔ خیال کی یکسانیت کے اعتبار سے ہم مذکورہ تمام علما کی آرا کو ایک خانہ میں رکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس باب میں ہم صرف انہیں تحریروں کو موضوع بحث بنائیں گے جو زمانی اعتبار سے انیسویں صدی میں منظر عام پر آئیں۔ مناسب ہے کہ ان تصانیف اور تحریروں کا زمانی تسلسل کے لحاظ سے جائزہ لیا جائے تا کہ ان میں پیش کردہ خیالات سے آگہی حاصل کی جاسکے۔

اردو زبان کے آغاز اور ابتدا سے متعلق اردو زبان میں لکھی گئی ایسی کوئی تحریر میر امن دہلوی کی تصنیف ''باغ و بہار'' سے قبل نظر نہیں آتی ہے۔ یوں تو تحقیق میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی پھر بھی ماہرین کے نزدیک میر امن کی تحریر یعنی ''باغ و بہار'' کے مقدمہ کو اوّلیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں نامور محقق بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

> ''میر امن ہندیوں مین پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو زبان کے بننے اور اس کے نشو نما کا حال لکھا ہے''۔[۱]

اردو کے ایک معتبر محقق گیان چند جین نے بھی نہ صرف اوّلیت کا سہرا ان کے سر باندھا بلکہ ان کا خیال ہے کہ:

> ''بعد کے لوگوں میں نہ صرف اہل اردو نے بلکہ اہل مغرب نے بھی اس نظریہ سے اثر قبول کیا اور اس کی تقلید بھی کی''۔[۲]

---

[۱] مقدمات عبدالحق: مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۳۳۶

[۲] اردو کے آغاز کے نظریے،..... گیان چند جین، ص ۴۱

بہت ممکن ہے کہ میر امن سے قبل اس نوعیت کی کوئی تحریر موجود ہو لیکن اب تک کی معلومات کی روشنی میں باغ و بہار کے مقدمے کو اس سلسلے کا نقطہ آغاز کہہ سکتے ہیں، اس لئے کہ ایک مدت تک اسی خیال کی بنیاد پر اردو کی ابتدا اور اس کی جائے پیدائش کا تصور قائم رہا۔

## میر امن دہلوی کا نظریہ مقدمہ ''باغ و بہار'' کی روشنی میں:

میر امن کا نام میر امان تھا۔ امؔن اور لطفؔ تخلص کرتے تھے۔[۳۱] دہلی کے رہنے والے تھے اس لئے میر امن دہلوی کہلائے۔ اردو زبان وادب کی تاریخ میں ان کا شمار بحیثیت مصنف، مترجم اور شاعر کے ہوتا ہے۔ میر امن کے نام کو سب سے زیادہ شہرت ان کی تصنیف ''باغ و بہار'' سے ملی۔ ان کی اس کتاب کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ میر امن نے فورٹ ولیم کالج میں قیام کے دوران گلکرسٹ کی سرپرستی میں میر عطا حسین خان تحسین کی مشہور کتاب ''نوطرز مرصع'' جو فارسی قصہ چہار درویش کا نقل ترجمہ ہے اسے ''باغ و بہار'' کے نام سے آسان ہندوستانی میں منتقل کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ باغ و بہار لکھتے وقت اس کتاب کے ساتھ ان کے سامنے فارسی کا قصہ بھی موجود تھا۔

''باغ و بہار'' سے موسوم کتاب کئی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ مثلاً اس کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے یہ کتاب ایک دلچسپ داستان ہے جو آج بھی بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ اس کا ترجمہ نہایت شستہ اور آسان ہندوستانی زبان میں کیا گیا ہے جو اس وقت ٹکسالی زبان کی حیثیت سے دہلی میں رائج تھی۔ ترجمہ میں استعمال کی گئی زبان ہی اس کتاب کا حسن ہے۔ میر امن نے اپنی رواں طبیعت سے اس ترجمہ میں بہت کچھ زیب داستان کے لئے بڑھا دیا ہے۔ اس لئے اس کتاب کو کچھ علماء ترجمہ نہیں بلکہ تصنیف کے خانے میں جگہ دیتے ہیں۔ اردو نثر کی تاریخ میں اسے سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے مقدمے میں مصنف نے اردو زبان سے متعلق اپنی آرا پیش کی ہے جو اردو میں اس نوعیت کی پہلی تحریر ہے۔ ہماری گفتگو کا محور ''باغ و بہار'' کا یہی پہلو ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۰۲ء میں ہندی مینول پر ٹائپ ہو کر منظر عام پر آئی۔ لیکن باضابطہ طور پر ۱۸۰۴ء میں کلکتے سے

---

[۳۱] باغ و بہار : مرتبہ رشید حسن خاں، ص۔ ۲۹

ہندوستانی چھاپہ خانے سے شائع ہوئی۔[۴] 'باغ و بہار' کے مقدمے میں میر امن اردو زبان سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ انہیں کے راجہ پرجا قدیم سے رہتے ہیں اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمان کا عمل ہوا ہے۔ سلطان محمود غزنوی آیا پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی آخر امیر تیمور نے (جس کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار 'اردو' کہلایا......
جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کر مقرر ہوئی۔ جب حضرت شاہ جہاں ...... اپنا دارالخلافت بنوایا تب سے شاہ جہاں آباد مشہور ہوا، اور وہاں کے بازار کو اردوے معلیٰ خطاب دیا۔
......زبان اردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کے کسی شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی''۔[۵]

میر امن نے اپنا یہ خیال باغ و بہار کے دیباچے میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ایک بات جو سب سے اہم ہے اور وہی اس کتاب کا اختصاص ہے کہ جس زمانے میں یہ کتاب منظر عام پر آئی اس زمانے کی

---

[۴] باغ و بہار : مرتبہ رشید حسن خاں، ص۔۸

[۵] باغ و بہار : مرتبہ رشید حسن خاں، ص۔۲۹

نثر کی روش سے اس کی زبان بالکل مختلف تھی۔ اپنی اس تحریر کو دوسروں سے ممیّز کرنے کے لیے میر امن نے اسے دہلی کی خاص زبان سے منسوب کیا اور پھر اس کی ابتدا اور ارتقا پر روشنی ڈالی۔ ان کے اس نظریے کی علمی حلقوں میں خوب دھوم مچی اور بعد کے زیادہ تر لکھنے والے اسی کو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ایک عرصے تک پیش کرتے رہے۔ یہاں سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ اردو سے متعلق میر امن کے اپنے خیالات تھے یا اس سے قبل بھی اس کی کوئی حقیقت موجود ہے؟ یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ میر امن نے ''باغ و بہار'' کا ترجمہ فورٹ ولیم کالج میں گل کرسٹ کی سرپرستی میں کیا تھا۔ پھر بھلا یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میر امن، جان گل کرسٹ سے اثر قبول کئے بغیر رہ جاتے۔ واقعہ یہ ہے کہ گل کرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں 'ہندوستانی لینگویج' کی ایک گرامر شائع کی جس کے باب نہم میں اردو کو ملواں بولی قرار دیا ہے۔[٦] ایسا لگتا ہے کہ میر امن نے اپنا یہ نظریہ گل کرسٹ کے خیال سے ہی اخذ کیا ہے۔ حالانکہ یہ گل کرسٹ کا کوئی باضابطہ نظریہ بھی نہیں تھا۔ اس کی ایک مشہور کتاب "A Grammar of the hindustanee language" کا اقتباس اس طرح ہے کہ:

> ''بہترین شعرا کے مختلف قسم کے اشعار سے نمونے پیش کروں گا۔ یہ وہ شعرا ہیں جنہوں نے اپنی کئی تصنیفات اس ملواں بولی میں لکھی ہیں جسے ''اردو'' بھی کہا جاتا ہے، یعنی دربار کی شستہ زبان''۔[۷]

اردو زبان سے متعلق گل کرسٹ کی ایسی کوئی باضابطہ تحریر یا کتاب نہیں تھی جو عوام تک پہنچی ہو۔ لیکن اس کے برعکس فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں ''باغ و بہار'' کو جو شہرت اور قبول عام نصیب ہوا اس پائے کو کالج کی کوئی تصنیف نہیں پہنچ سکی۔ یہ اس زمانے سے لے کر آج تک اہل اردو میں بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''باغ و بہار'' کے مقدمے میں اردو زبان سے متعلق پیش کئے گئے خیالات کی خوب شہرت ہوئی۔ میر امن کے اس خیال کی توسیع نہ صرف اہل اردو نے کی بلکہ ساتھ ہی گریرسن جیسا ماہر لسانیات بھی اس کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ گریرسن نے میر امن سے متاثر ہو کر کلکتہ ریویو، جلد اول میں اردو زبان سے متعلق جو خیال ظاہر کیا ہے اس کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں:

---

٦۔ اردو کا ابتدائی زمانہ: شمس الرحمٰن فاروقی، ص۔۱۹

۷۔ ایضاً، ۱۹

> ''اردو قواعد اور فرہنگ الفاظ کے لحاظ سے مخلوط، عام اور مشترک زبان ہے۔ اس میں شمالی ہندوستان کی مقامی بولیوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، تلگو زبان کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ اس کے صرفی ونحوی قواعد نے شمالی ہند کی عام بولیوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ ایک مخصوص اور معین زبان سے ترقی پا کر بنی ہے۔''[8]

بعد میں گریرسن نے یہ اعتراف کرلیا تھا کہ اس نے جو کچھ لکھا وہ باغ و بہار کے دیباچے سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ اس طرح میر امن کے نظریہ کے حوالے سے ہمیں یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ اردو زبان سے متعلق اس نوعیت کے خیالات پیش کرنے والوں میں میر امن کا نام سرفہرست ہے اور اس زمانے کے اکثر و بیشتر اہل علم نے ان کی تقلید کی۔ میر امن کے خیالات بہ الفاظ دیگر اس طرح بیان کیے جاسکتے ہیں کہ ہندوستان کا شہر جہاں ہندو بستے تھے وہیں مسلمان وارد ہوئے۔ اور وہ بھی ایسے کہ کوئی ترک تھا تو کوئی مغل یعنی یہ مختلف نسل کے عوام تھے۔ ان سب کے شہر میں یکجا ہونے سے شہر کا بازار ''اردو'' کہلایا۔ یہ سب ایک ہی بازار میں خرید و فروخت کرتے تھے۔ ان کے آپسی لین دین اور رابطے کی ایک زبان مقرر ہوئی اور یہی زبان اردو کہلائی۔ چوں کہ یہاں آنے جانے والے لوگ اپنے قوم، نسل، مذہب اور زبان کے اعتبار سے مختلف تھے۔ ان کے باہم ربط سے ایک نئی زبان وجود میں آئی اور منجتے منجاتے ایسی ہوئی کہ کسی شہر کی زبان اس سے میل نہیں کھاتی۔ اسی زبان کا چلن عام ہوا اور پورے ملک میں سمجھی اور بولی جانے لگی۔ بہر حال یہ زبان ملوان یا ملغوبہ تھی اور دہلی اس کی جائے پیدائش تھی یہیں اس کو فروغ پانے کا موقع ملا۔

میر امن کے مندرجہ بالا خیالات سے ان کا موقف سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بس اردو زبان کے آغاز و ابتدا سے متعلق انہیں اس موقع سے کچھ رقم کرنا تھا سو انہوں نے کیا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ان کے الفاظ ایک مخصوص نظریہ کو اساس فراہم کریں گے اور ایک مخصوص گروہ کی نمائندگی کریں گے۔ متذکرہ تلخیص یا میر امن کے الفاظ کا ماحاصل اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا

---

[8] اردو لسانیات: ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۔ ۹

ہے کہ میر امن اردو زبان کا ''اختلاطی نظریہ'' پیش کیا ہے۔ ماہرین نے میر امن کے اس مختصر اقتباس کو اعتراف کے ساتھ اعتراض اور تنقید کی نظر سے بھی دیکھا ہے۔ ''مقدمہ باغ و بہار'' میں مولوی عبدالحق بھی میر امن کے اقتباس کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے ایک سوالیہ نشان قائم کر جاتے ہیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مخلوط زبان ہے جس نے بالکل نئی اور علاحدہ صورت اختیار کر لی ہے اور اس نظر سے بھی اس کا دیکھنا ضروری ہے''۔[9]

حافظ محمود خاں شیرانی میر امن کی آرا پر مجموعی طور پر اظہار خیال فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''یہ بیانات جو ہمارے تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے آئے ہیں جو حقیقت سے بہت دور ہیں۔ ہمیں ان کو صرف بزرگوں کے تبرک کے طور پر تسلیم کر لینا چاہیے۔ ورنہ کیا اکبر اور شاہ جہاں سے پہلے دلّی نہ تھی۔ یا ہندو اور مسلمان نہ تھے۔ یا لوگ سودا سلف نہیں لیتے تھے......''[10]

ایسے جملوں سے شیرانی کا موقف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ اس نوعیت کے خیالات کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے۔ یہاں دیگر علمائے لسانیات کے خیالات سے قطع نظر، شمس الرحمٰن فاروقی کا ذکر مناسب ہوگا کیوں کہ انہوں نے میر امن اور ان کے نظریہ کی تنقید بڑی باریکی سے پیش کی ہے۔ سب سے پہلے وہ لکھتے ہیں کہ:

''میر امن کا بیان جھوٹ سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ میر امن نے جو لکھا وہ انگریزوں کے زیر اثر لکھا، اور انہیں خوش کرنے کے لئے لکھا''۔[11]

---

[9] مقدمات عبدالحق: مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص۔ ۲۳۷

[10] پنجاب میں اردو: حافظ محمود شیرانی، ص۔ ۲۵، ۲۶

[11] اردو کا ابتدائی زمانہ: شمس الرحمٰن فاروقی، ص۔ ص ص۔ ۳۰، ۳۱

سلسلۂ گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے فاروقی نے میر امن پہ چار اعتراضات کئے ہیں یہ سب زمانی نوعیت کے ہیں۔شروع کے تین اعتراضات مختلف مسلمان فرمارواؤں کے عہد حکومت کو ایک ہی تسلسل میں بیان کرنے سے متعلق ہیں۔مثلاً محمود غزنوی (وفات ۱۰۳۰ء)، محمد غوری (وفات ۱۲۰۶ء)، سلطان بہلول لودی (زمانۂ حکومت کا آغاز ۱۴۵۲ء) اور (تیمور ۱۳۹۸ء) میں یہاں آکر جا چکا تھا۔ ان بادشاہوں کے عہد میں واضح کئی انفصال ہیں۔لیکن محمود غزنوی سے لے کر ۱۸۰۱ء یعنی ''باغ و بہار'' کی تالیف تک بادشاہوں کے عہد کو ایک دوسرے سے متصل کر دیا گیا ہے۔لہٰذا اردو کی کہانی کو بادشاہوں کی کہانی سے مربوط کرنے کے لئے ایک فرضی تسلسل قائم کیا گیا ہے۔اور اردو زبان کی پیدائش انہیں فرمارواؤں کی آمد اور یہاں کے باشندوں سے ان کے اختلاط اور آپس میں اظہار خیال کا نتیجہ بتایا ہے۔ اردو کی زبان جو منج منجا کر میر امن کے زمانے تک پہنچتی ہے اور اس عہد میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔بقول میر امن کے انہوں نے اسی زبان میں ''باغ و بہار'' کا ترجمہ کیا ہے۔لیکن ان کے اپنے زمانے میں اردو کا مقبول ترین نام ''ہندی'' تھا۔

بہر حال یہاں ایک بات تسلیم کرنی چاہیے کہ مصنف جہاں ایک واضح تاریخی حقیقت سے کما حقہ انصاف کرنے سے قاصر ہے، پھر ایسی صورت میں زبان کی تاریخ کا باریک مسئلہ بیان کرنا یقیناً میر امن جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہم ان سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ موصوف لسانی تاریخ کا حق معروضیت کے ساتھ ادا کر دیں۔میر امن یا ایسے دیگر علمائے اردو ''زبان اردو'' کی تاریخ بیان کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم اردو زبان کی لسانی تاریخوں کے مذکور میں ایسی تحریروں کو فراموش نہیں کر سکتے۔کیوں کہ ان نثر پاروں کی حیثیت ابتدائی نقوش یا نمونے کی ہے اس لیے ان کا ذکر تبرک کے طور پر شامل ہونا چاہیے۔ یہاں اس سلسلے میں اس نوعیت کی چند اور تحریروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ان علماء کی فہرست میں سید انشا، امام بخش صہبائی، سر سید احمد، ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

## انشا اللہ خاں انشا کے خیالات دریائے لطافت کے حوالے سے:

سید انشا اللہ خاں انشاء گونا گوں شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو کسی ایک صنف ادب تک محدود نہیں رکھا۔ کیا شاعری اور کیا نثر دونوں ہی میدانوں میں اپنی شناخت قائم کی۔ جہاں ایک طرف ان کی شاعری سے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے پہلے دور کی کی نمائندگی کرتی ہے۔ تو دوسری طرف ان کی اعلیٰ قسم کی نثری تصانیف بھی موجود ہیں۔ چوں کہ یہاں ہمیں ان کی شاعری کی خصوصیات اور امتیازات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا موضوع بحث ان کی نثری تصنیف کے چند اقتباسات ہیں جو انہوں نے اردو زبان سے متعلق پیش کیے ہیں۔ ان کے فن پر خداداد ذہانت، طباعی، شوخی و ظرافت اور جدت طبع غالب ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں انشا کی اب تک جتنی کتابیں دستیاب ہیں ان کی کل تعداد پانچ ہے۔ دریائے لطافت، لطائف السعادت، رانی کیتکی کی کہانی، سلک گوہر اور ترکی روز نامچہ۔ ''رانی کیتکی کی کہانی'' ایک مختصر سی تصنیف ہے جس میں انہوں نے اہتماماً عربی اور فارسی کا کوئی لفظ نہیں آنے دیا ہے۔ انشا کی تمام تصانیف میں شاہ کار اور قابل قدر تصنیف ''دریائے لطافت'' ہے۔ یہ کتاب کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اردو صرف ونحو، زبان و بیان اور عروض و قواعد پر یہ اپنی طرح کی پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہل زبان نے لکھی اور ایسی کہ اب تک اس قسم کی دوسری نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلا حصہ 'اردو صرف ونحو' جو انشا کی تصنیف ہے اور دوسرا حصہ مرزا محمد حسین قتیل کا تالیف کیا ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق جن کی اردو ادب کے سرمائے سے بے پناہ محبت اور گراں قدر خدمت کا نتیجہ ہے کہ یہ کتاب اردو ترجمے کی شکل میں محفوظ ہے۔ موصوف اس کتاب کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

> ''کتاب کی جان پہلا حصہ ہے ....... حق یہ ہے کہ عجیب جامع اور بے مثل کتاب ہے۔ اردو زبان کے قواعد، محاورات اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی تھی اور عجیب بات ہے کہ اس کے بعد بھی کوئی کتاب اس پایہ کی نہیں لکھی گئی''۔[۱۲]

---

۱۲ دریائے لطافت، میر انشا اللہ خاں، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۱۵

یہ کتاب ۱۸۰۸ میں تصنیف ہوئی اور تقریباً ۴۱ برس بعد (۱۸۴۹ء) مرشدآباد میں طبع ہوئی۔ اور پھر تقریباً ستر سال تک گمنامی کے پردے میں پڑی رہی اور ۱۹۱۶ میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے مولوی عبدالحق نے دوبارہ شائع کرایا۔ ۱۹۳۵ء میں اس کتاب کا ترجمہ برج موہن دتاتریہ کیفی سے کرواکر انجمن سے دوسری بار اور کل ملاکر تیسری مرتبہ یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ انشاء نے اس کتاب کے پہلے باب میں ''اردو زبان کی کیفیت'' کے عنوان سے اردو زبان کا مولد اور مرکز موضوع بحث بنایا ہے۔ انشاء کا یہ مضمون مذکورہ مضامین کے سلسلے کی اگلی کڑی ہے۔ چوں کہ اس کتاب کا موضوع مختلف ہے اور اس میں کئی بحثیں اٹھائی گئی ہیں۔ انشاء اس کا آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''ہر ملک میں قاعدہ ہے کہ اس کے صاحب کمال اور فصحا ایک ایسے شہر میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ جہاں حکومت کے ارکان دولت رہتے ہیں اور ہر طرف کے لوگ حصول معاش کے لئے آتے رہتے ہوں، اس وجہ سے اس شہر کے رہنے والوں کی تحریر اور تقریر اس ملک کے اور شہروں کے باشندوں سے بہتر ہوتی ہے۔ ایران میں اصفہان ............ کی زبان اور بیان اور جگہ کے مقابلے میں سند مانی جاتی ہے اور اب بھی ہے۔ جیسا کہ استنبول، جو سلطنت روم کا دارالخلافہ اور جائے قیام رہا ہے۔ شاہ جہاں آباد چونکہ اکثر سلاطین مغلیہ کا دارالخلافہ اور جائے قیام رہا ہے اور چوں کہ فریقین کے فصیح و بلیغ اور جید عالم اور فنون لطیفہ وعلوم شریفہ کے ماہر اس خوبصورت شہر میں رہنے لگے۔ اس لئے اس شہر کو امتیاز حاصل ہے۔ اگر چہ لاہور، ملتان، اکبرآباد اور الہ آباد بھی ذی شوکت بادشاہوں کا مسکن رہے ہیں لیکن ان کو دہلی کے برابر نہیں کہہ سکتے کیوں کہ یہاں اور مقاموں کے مقابلے میں بادشاہوں کا قیام زیادہ رہا ہے۔ یہاں کے خوش بیانوں سے متفق ہوکر متعدد زبانوں سے اچھے اچھے لفظ نکالے اور بعض عبارتوں اور

الفاظ میں تصرف کر کے اور زبانوں سے الگ ایک نئی زبان پیدا کی، جس
کا نام 'اردو' رکھا''۔[13]

یہ تھی اردو کی کہانی سید انشاء کی زبانی جو اوپر نقل کی گئی۔ انشا' کے مذکورہ خیالات اور بالخصوص آخری جملے سے ایسا لگتا ہے کہ اس زمانے میں بلکہ دوسرے لفظوں میں اگر یہ کہا جائے تو بجا ہے کہ انیسویں صدی میں اردو زبان کے متعلق شاید یہی مفروضہ قائم تھا کہ اردو یعنی زبان اردو ایک ملواں اور مغلوبہ زبان ہے جس کا خمیر عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور دیگر زبانوں کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ کسی بھی زبان کے وجود پذیر ہونے کی حقیقت اور مختلف قوموں کے اختلاط کے اثرات ونتائج پر گذشتہ صفحات میں قدرِ بحث کی گئی ہے اور آئندہ صفحات میں بھی تفصیلی گفتگو پیش کی جائے گی۔ مختصر یہ کہ انشاء کے خیالات کا شمار بھی میر امن کے نقطۂ نظر کے ضمیمے کے طور کیا جاتا ہے۔ آیئے ایسے ہی چند اور علماء کے خیالات پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے جن کی کوئی غیر معمولی اہمیت تو نہیں مگر ان خیالات کو اس ضمن میں نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔

امام بخش دہلوی صہبائی، غالب، مومن، سرسید کے معاصرین میں تھے۔ ۱۸۴۰ء میں بحیثیت استاذ دہلی کالج ان کی تقرری ہوئی اور بعد میں فارسی کے صدر مدرس کے عہدے تک پہنچے۔[14] اپنے زمانے میں انہیں مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں مومن کے ہمسر فارسی کا استاد تسلیم کیا جاتا تھا۔ ان کی تصنیف وتالیف کردہ کتابیں اس زمانے میں شامل نصاب بھی رہیں اور ان میں زیادہ تر کو قبول عام نصیب ہوا۔ وہ سرسیّد کے دوست تھے آثار الصنادید کی تکمیل میں انہوں نے سرسیّد کے ساتھ پوری طرح تعاون کیا تھا۔ اردو صرف ونحو کے موضوع پر ان کی بے حد مشہور اور پائے کی تصنیف ہے جو ''رسالہ قواعد صرف ونحو اردو'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ کتاب دراصل میر شمس الدین فقیر کی ''حدائق البلاغت'' کا ترجمہ ہے جیسا کہ خود صہبائی نے اس کتاب کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق ترجمہ ''حدائق البلاغت'' صہبائی کی اولین اردو تصنیف ہے جو ۱۸۴۴ء میں طبع ہوئی۔[15] اس کتاب میں صہبائی نے اردو کی پیدائش

---

[13] دریائے لطافت، میر انشا اللہ خاں، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۱۵

[14] دہلی کالج مرحوم: مولوی عبدالحق، ص۔ ۱۵۳

[15] امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات: ڈاکٹر محمد ذاکر حسین، ص۔ ۱۳۳

کے متعلق اپنا خیال پیش کیا ہے۔ یہ کتاب چار ابواب اور ایک مقدمے پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا باب علم صرف، دوسرا نحو، تیسرا بیان لغت اور چوتھا مثلوں کے بیان میں ہے۔ اس کا مقدمہ اردو کی تحقیق و تاریخ سے متعلق ہے۔ اردو زبان سے متعلق صہبائی کا بیان کچھ اس طرح ہے، وہ فرماتے ہیں:

''زبان اردو ہندوستان کی زبانوں میں مثل زبان دری کے ہے...... محقق ہے وہ یہ ہے کہ دری مرکب ہے لفظ در اور یائے نسبت سے اور در بہ معنی دربار کے ہے پس دری کے معنی یہ ہیں منسوب دربار کے ساتھ اور دربار سے جمشید کا دربار مراد ہے یعنی یہ زبان جمشید کے دربار کے حاضر ہونے والوں کی ہے اور محل خاص میں اس زبان کے علیحدہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ ازبس کہ اطراف کے لوگ وہاں جمع ہوتے تھے ان سب کی زبان کے الفاظ مخلوط ہو کر ایک زبان جداگانہ حاصل ہوگئی۔ اسی طرح سے زبان اردو اور یہ لفظ فارسی ہے بہ معنی لشکر کے ظاہراً لشکر سے اس جائے میں مراد لشکر شاہ جہاں بادشاہ ہے کس واسطے کہ اردو شاہ جہاں آباد کے رہنے والوں کی زبان کا نام ہے۔ ازبس کہ اردوئے معلٰی شاہی میں اطراف و جوانب کے آدمی مجتمع تھے۔ ان سب کی زبان مل کر یہ زبان حاصل ہوئی اور اس کو زبان اردو کہتے تھے بعد مدّت کے لفظ زبان کا محذوف ہو کر اس زبان کا نام اردو ہو گیا۔ اس واسطے اس زبان میں الفاظ عربی اور فارسی بلکہ سنسکرت کے بھی پائے جاتے ہیں۔''[16]

## اردو سے متعلق سرسیّد احمد کے خیالات:

اردو زبان سے متعلق خیال آرائی کی ایک جھلک سرسید کے یہاں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ سرسید اور ان کے کارناموں کے تصانیف کی یہاں ہر چند ضرورت نہیں، اردو زبان و ادب کا کون ایسا طالب علم ہوگا

---

[16] رسالۂ قواعد صرف و نحو اردو، امام بخش دہلوی صہبائی، ص ۴

جو سرسید سے بخوبی واقف نہ ہو پھر بھی جیسا کے سرسید ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، زندگی کا کوئی ایسا شعبۂ علم شاید ہی بچا ہو جہاں وہ اثر انداز نہ ہوئے ہوں۔ فکر و عمل کے ہر ممکن میدان میں انہوں نے اپنا نقش بٹھایا۔ بالخصوص اردو زبان و ادب کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو وہ اس کے اولین معماروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ سرسید نے نہ صرف اردو زبان کی تحفظ و بقا کے لئے موثر اقدام اٹھائے بلکہ اسے خود غیر معمولی ترقی دے کر اردو کے نشو نما اور ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان یا اردو نثر کو عوام سے قریب لا کھڑا کیا اور اسے سادہ و شستہ بنا کر اجتماعی زندگی کا ترجمان اور عملی و ادبی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

سرسید نے اردو زبان کی پیدائش اور جائے پیدائش سے متعلق اظہار خیال اپنی مشہور زمانہ تصنیف آثار الصنادید کے باب چہارم میں کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۴۶ء میں لکھی گئی اور ۱۸۴۷ء میں بہ اہتمام سید عبدالغفور صاحب کے طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔ بعد میں اس مضمون کو مولانا اسمٰعیل پانی پتی نے مقالات سر سید کے تدوین و ترتیب کے ساتھ اسے ساتویں جلد میں شامل کر کے ۱۹۶۲ء میں طبع کرایا۔ اس باب میں ''زبان کا بیان'' کے عنوان کے تحت سرسید فرماتے ہیں:

> ''اس ملک میں اب جو زبان مروج ہے جس میں سب لوگ بولتے چالتے ہیں اس کا نام 'اردو' ہے۔ اور تحقیق اس کی یوں ہے کہ 'اردو' فارسی لفظ ہے اور اس کے معنی 'بازار' کے ہیں اور 'اردو' سے مراد اردوئے شاہ جہاں ہے۔ اگر چہ دلّی بہت قدیم شہر ہے اور ہندوؤں کے تمام راجا پرجاؤں کا ہمیشہ سے دارالسلطنت رہا ہے، لیکن سب اپنی اپنی بھاکا اور ایک کی دوسرے سے زبان نہیں ملتی تھی، ...... جب کہ شہاب الدین شاہ جہاں بادشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا اور سب ملکوں کے وکلاء کے حاضر رہنے کا حکم دیا اور دلی شہر کو نئے سرے سے آباد کیا اور قلعہ بنایا اور شاہ جہاں آباد اس کا نام رکھا۔ اس وقت اس شہر میں تمام لوگوں کا مجمع ہوا، ہر ایک کی گفتار، رفتار جدا جدا تھی۔ جب آپس میں معاملہ کرتے ناچار

ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اس کی زبان، کلمے، تین لفظ دوسرے کی زبان کے ملا
کر بولتے اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ
خود ایک نئی زبان ہوگئی اور جو کہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی
اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے اور بادشاہی امیر و امراء اس کو بولا
کرتے تھے، گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی۔ ہوتے ہوتے
خود اس زبان ہی کا ''اردو'' نام ہوگیا۔''[17]

ہمارے سامنے اسی طرح کے خیالات پیش کرنے والوں کی فہرست میں دو اور علماء کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہاں مناسب یہ ہے بے جا طوالت سے بچنے کے لئے ان حضرات کے خیالات کا خلاصہ من و عن تسلسل کے ساتھ پیش کر دیا جائے اور بحیثیت مجموعی ان باتوں کی شرح و بسط کی جائے۔ دراصل ان علماء کی رائیں یعنی میرامن تا ڈپٹی نذیر احمد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی نوعیت کے خیال کی مختلف کڑیاں ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کا شمار اردو کے ممتاز ترین ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اردو کے اولین ناول نگار ہیں بلکہ اپنی گوناگوں شخصیت میں وہ بیک وقت ادیب، مترجم، مقرر اور شاعر بہت کچھ نظر آتے ہیں۔[18] عام طور پر ڈپٹی صاحب کو لوگ اردو کا اولین ناول نگار مانتے ہیں۔ اور ان کے اصلاحی ناولوں کی وجہ سے ایک مصلح اور سرسید کی اصلاحی تحریک کا مبلغ جانتے ہیں۔ جیسا کہ وہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے زبردست حامی تھے اور اپنی تحریر، تقریر اور ناولوں کے ذریعہ اس مشن کی تکمیل کے لئے سرگرداں اور کوشاں رہے۔ لیکن اس کے علاوہ شمس العلماء، ڈپٹی نذیر احمد کی علمی زندگی کا ایک اور پہلو ہے جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ یعنی ان کی زبان دانی، لسانی رمز شناسی، قواعد نویسی، لغت نگاری اور املا و انشاء سے ان کی گہری دلچسپی ہے۔[19] امام بخش صہبائی کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کا نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ انہوں نے بھی اردو زبان سے متعلق موضوع پر اپنا خیال

---

[17] آثار الصنادید: سرسیّد احمد خاں، باب چہارم، ص۔ ۱۱، ۱۲، ۱۳

[18] ڈپٹی نظیر احمد بہ حیثیتِ زبان داں، مرزا خلیل احمد بیگ، رسالہ فکر و نظر، خصوصی شمارہ ڈپٹی نظیر احمد، ص ۱۹۵

[19] ایضاً، ص۔ ۳۳

پیش کیا ہے۔'صرف صغیر' جوانہوں نے ۱۸۷۰ء میں لکھی اور ۱۸۷۱ء میں آگرے سے طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔اس کا موضوع جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے۔یہ کتاب زبان اور قواعد سے متعلق ہے۔ اسی کتاب میں اردو زبان سے متعلق انہوں نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔یہاں بھی کچھ نیا نہیں ہے بلکہ پرانی باتیں ہی دہرائی گئی ہیں۔اس کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

''اردو کے معنی ہیں لشکر، پس یہ بولی ایک لشکر کی بولی ہے۔اکبر کے وقت میں جو لشکر تھا اس میں ہر ملک کے آدمی تھے اور ان کو رعایہ سے ملنے کی ممانعت تھی۔اس واسطے کہ لشکر کے سپاہی جب رعیت سے اختلاط پیدا کرتے ہیں تو خاص شہر سے ان کو انس ہو جاتا ہے۔پھر ان کا دل باہر جانے اور لڑنے مرنے کو نہیں چاہتا۔اکبر نے اپنے لشکر والوں کو رعیت سے ملنے نہ دیا۔اس لشکر میں رفتہ رفتہ یہ اردو بولی پیدا ہو گئی تھی۔اس بولی میں ہر ملک کے لفظ ہیں۔عربی، سنسکرت، ترکی، کشمیری، چینی، مرہٹی ہر بولی اس میں پائی جاتی ہے اور سب بولیاں گڈمڈ ہو کر یہ زبان پیدا ہوئی۔''[۲۰]

امام بخش صہبائی دہلوی، سر سید احمد خاں، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کا بیان اوپر بالترتیب پیش کیا گیا۔جو باتیں ان حضرات کے بیانات میں مشترک ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو ایک ملوّاں و مغلوبہ زبان ہے۔ان میں دو صاحبان نے اردو کی پیدائش کو شاہ جہاں کے عہد اور دربار سے منسوب کیا ہے۔جب کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اس داستان کو دو قدم آگے بڑھ کر اکبر کے دربار سے وابستہ کر دیا ہے۔ان کے مطابق اکبر نے اپنے لشکر والوں کو رعیت سے ملنے نہ دیا اس لشکر میں رفتہ رفتہ یہ اردو بولی پیدا ہو گئی۔اس ضمن میں یہ بات ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ کسی بھی زبان کی ابتدا یا پیدائش وقت کہ کسی مخصوص نقطہ میں نہیں ہوتی بلکہ زبانوں بانوں کی تشکیل ایک طویل زمانے کو محیط ہوتی ہے۔مذکورہ تمام باتوں پہ بحیثیت مجموعی گفتگو پیش کرنے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ محمد حسین آزاد کے خیالات پر بھی ایک نگاہ ڈالی جائے۔

---

[۲۰] ڈپٹی نذیر احمد بحیثیت زبان داں : مرزا خلیل احمد بیگ، ص۔..... مضمون، مشمولہ فکر و نظر، شمارہ

## محمد حسین آزاد کا نظریہ : آب حیات کی روشنی میں

شمس العلما محمد حسین آزاؔد کی مشہور زمانہ تصنیف "آب حیات" کی پہلی اشاعت ۱۸۸۰ء میں عمل میں آئی۔ اس کتاب کی اہمیت کئی اعتبار سے مسلم ہے۔ اول کہ یہ کتاب مشاہیر شعرائے اردو کا سوانحی تذکرہ اور اردو میں باقاعدہ تنقید کا پیش خیمہ ہے۔ اس لیے عام طور پہ یہ کہا جاتا ہے کہ "آب حیات" اردو شعرا کے تذکروں اور اردو تنقید کے بیچ کی کڑی ہے۔ دوم محمد حسین آزاؔد کی دیگر تصانیف کی طرح اس کتاب میں بھی ان کی زبان کے جوہر اور مرقع نگاری کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کتاب کی ایک بڑی اہمیت یوں ہے کہ اس میں آزاد نے اردو کی ابتدا سے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا ہے اور اس زبان کی عہد بعہد ترقیوں اور اصلاحوں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق انیسویں صدی میں مختلف علما کی تحریریں پیش نگاہ رہی ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر متذکرہ تمام تحریروں میں بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنی مذکورہ تصنیف کی ابتدا ان جملوں سے کرتے ہیں:

> "اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردہ پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔"[۲۱]

مکمل دیباچے میں متذکرہ اجمال کی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ایک باقاعدہ بحث اٹھائی گئی ہے۔ مصنف نے اپنے اس خیال کی تائید میں صفحات سیاہ کیے ہیں اور دلیلوں سے اس مفروضے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ آزاد کے خیال اور ان کی پیش کش کے متعلق مسعود حسین خاں فرماتے ہیں:

> "ہمارے یہاں لسانی تحقیق کے مرد میدان آزاؔد ہیں جنھوں نے سب سے پہلے آب حیات میں اردو زبان کی تاریخ کو سلسلہ وار بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔"[۲۲]

---

[۲۱] آب حیات: محمد حسین آزاد، ص۔ ٦

[۲۲] مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خاں، ص۔ ۱۸۸

آزاد کے اس خیال کا اس زمانے میں علمی حلقوں میں خوب چرچا رہا اور عام طور پر لوگ برج بھاشا کو ہی اردو کی ماں سمجھتے رہے۔ مصنف کا نام اس نظریہ کے حوالے سے بھی خاصا مشہور ہوا۔ اس کی تائید اور تردید میں اس وقت سے اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہم آیندہ سطور میں اس سے متعلق مختلف ماہرین کے خیالات پیش کریں گے لیکن اس سے پیشتر مناسب ہوگا کہ آزاد کے خیالات کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لیے ان کے مذکورہ چند جملوں پر اکتفانہ کرتے ہوئے ان کے مکمل خیال کی تلخیص اور اس کا سیاق پیش کیا جائے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا کا پہلا ہی جملہ ان کے عہد کے دوسرے لکھنے والوں سے انہیں ممیّز کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کم سے کم محمد حسین آزاد یہ شعور رکھتے تھے کہ اردو ایک ملغوبہ زبان نہیں ہے بلکہ اس کی اصل برج بھاشا ہے جو خالص ہندوستانی زبان ہے اور اس کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ ہم نے سطور بالا میں یہ دیکھا ہے کہ آزاد کے نزدیک اس زبان کی عمر آٹھ سو سال ہے۔ اور اس کی میراث قدیمی کی جستجو میں وہ سنسکرت زبان تک مراجعت کرتے ہیں لیکن یہاں بھی مطمئن نہیں ہوتے اور ہندوستان کو مختلف قوموں کے ورود کی آماج گاہ بتاتے ہوئے ایک مہذب قوم آریوں کی آمد کا ذکر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک جانب موصوف آریوں کی تہذیب کی بالا دستی اور ان کی ہمہ گیریت کے معترف ہیں تو دوسری طرف ہندوستانی زبان کی ابتدا اور ارتقا کا سہرا ان کے سر باندھتے ہیں۔ اس قوم کی تہذیب اور تاریخ دانائے فرنگ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عجیب نہیں کہ ان کی زبان اپنی اصل سے کچھ کچھ بدل کر سنسکرت کی شکل اختیار کر گئی ہو۔

اس دیباچے میں سنسکرت زبان کی ابتدا اور اس کی تفصیلات کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد مختلف زمانوں میں ہندوستان کی لسانی تاریخ کا خاکہ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اس امر کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ بودھ مذہب کے نمو کے باعث آریوں کی زبان پر کس نوعیت کے اثرات مرتب ہوئے۔ آریا اپنی زبان کے معاملے میں بے حد حسّاس واقع ہوئے تھے۔ بودھ مذہب کے اثر سے اس زمانے میں فطری اور علاقائی بولیوں کو بڑی حد تک تقویت ملی۔ اس نوع کے لسانی تغیرات نے آریوں کو اپنی زبان کے متعلق مزید حساس بنا دیا تھا۔ وہ اپنی زبان کو ''زبانِ الٰہی'' سمجھتے تھے اس لیے اس کو منظّم کرنے کی کوشش میں جٹ

گئے۔شودروں اور ناپاک طبقوں کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدام اٹھائے۔اس طرح واقعات کے تسلسل میں آریوں کی ابتدائی زبان کے نشیب وفراز کا ذکر بھی آتا ہے۔اس رو میں آزاد نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں آریوں کی آمد اوران کے لسانی ارتقا سے بحث کرتے ہیں بلکہ یہاں ہندوستان میں آریوں کی آمد سے قبل ان کی زبان کے ساتھ ایران میں میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیلات بھی بیان کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی فارسی اور سنسکرت کی مماثلتوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

مصنف کو اس بات کا احساس ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد یہاں کی زبانوں میں بڑی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ دونوں قوموں نے ایک دوسرے کی زبان کے الفاظ اختیار کرنا شروع کر دیے۔ بارہویں صدی میں شہاب الدین غوری کے اثر سے تو کم لیکن سولہویں صدی میں یعنی اکبر کے زمانے تک ہندو مسلم کافی حد تک شیر وشکر ہو چکے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کے زبان نے ایک نئی ترکیب اختیار کر لی۔ زبان کے جو نمونے جہاں تک مصنف کو دستیاب ہوئے مثلاً پرتھوی راج راسو کے علاوہ، امیر خسرو، کبیر داس، گرو نانک، اور ملک محمد جائیسی کی تخلیقات سے پیش کئے ہیں۔ یہاں اس تلخیص کے اختتام پر مذکورہ تصنیف کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

''اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا؟ ظاہر ہے کہ کئی سو برس سے اسلام آیا ہوا تھا۔ جن کے باپ دادا کئی پشت یہیں کی خاک سے اٹھے اور یہیں پیوند زمین ہوئے۔ انہیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سر رشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی ہوتی ہوگی۔ ......مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے۔ اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ ان کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے اور جتنا یہاں رہنا سہنا استقلال زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانے میں کہ

اقبال تیموری کا آفتاب اوج پر تھا شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلّی دار الخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے اہل سیف، اہل قلم، اہل حرفہ اور تجّار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا۔''[۲۳]

محمد حسین آزاد کے خیالات کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے ان کی تحریر سے دو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں مزید اس کی تلخیص بھی بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے پہلے اقتباس سے ایسا تاثر قائم ہوتا ہے کہ مصنف یہ شعور رکھتا ہے کہ اردو ایک ملغوبہ زبان نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی ایک اصل ہے یعنی برج بھاشا جو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ ہمیں معلوم ہے اردو زبان کی لسانی تاریخ نویسی پر بیسویں صدی میں سائنسی رویہ اختیار کیا گیا۔ عام طور پر زبان مذکور کے ماخذ کی نشاندہی کے ساتھ علماء نے اس کا جواز بھی پیش کیا ہے۔ اس طرح مباحثہ کی تکرار نے ایک واضح شکل اختیار کر لی اور ہماری زبان اردو کی اصل اور اس کے وطن کی نشاندہی بہر حال کر لی گئی۔ اس حتمی شکل پر ماہرین تقریباً مطمئن ہو گئے اور اور یہ قضیہ ایک مسلم حقیقت بن کر سامنے آیا۔ محمد حسین آزاد کے ابتدائی جملوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی یہی رویّہ اختیار کیا لیکن نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریر کی ابتدا میں اردو کے ماخذ کی نشاندہی تو کی ہے اور اس کے بعد ایک طویل مقدمہ بھی قائم کیا ہے لیکن اپنے موضوع کا حق ادا نہیں کر پائے۔ ماحصل تک آتے آتے گڈمڈ کر جاتے ہیں اور اپنے پیش رووں کی ڈگر اختیار کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کے مفروضے کی اساس اور اردو زبان کی اصل ان دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ زبانوں کی اصل اور اس کے ماخذ کی نشاندہی اس کی صوتی، صرفی اور نحوی مماثلتوں پر ممکن ہے۔ یہاں اس واقعہ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ محمد حسین آزاد سے قبل اردو کے برج بھاشا سے مرتقی ہونے کا نظریہ ڈاکٹر ہارنلے نے پیش کیا تھا۔ ہرنلے کے اس خیال کو ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تصنیف

---

[۲۳] آب حیات: محمد حسین آزاد، ص۔۱۹

میں نقل کیا ہے۔ یہاں پہلے شوکت سبزواری کے الفاظ پیش کیے جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''یہ نظریہ سب سے پہلے ڈاکٹر ہارنلے نے پیش کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس کی نشر و اشاعت کی۔ مولانا شیرانی مرحوم کی قابل قدر کتاب'' پنجاب میں اردو'' کی اشاعت سے پہلے یہ نظریہ عام طور سے صحیح سمجھا جاتا تھا اور ہر شخص جسے اردو زبان سے دلچسپی ہے اس پر اعتقاد رکھتا تھا۔'' [۲۴]

سر دست مناسب ہوگا کہ ہارنلے کے اس خیال کا ذکر کیا جائے جو اس نے اردو کے آغاز و ابتدا سے متعلق پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اردو مقابلتہً حال کی پیداوار ہے۔ یہ دہلی کے نواح میں جو مسلم اقتدار کا مرکز اور برج، مارواڑی اور پنجابی کا سنگم تھا۔ مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے اختلاط و ارتباط سے ایک ملی جلی زبان (اردو) وجود میں آئی جو صرفی نحوی اصول کی حد تک برج ہے۔ اگر چہ اس میں پنجابی اور مارواڑی کی آمیزش بھی ہے۔ اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی یعنی فارسی اور عربی۔'' [۲۵]

بہت ممکن ہے کہ آزاد کو اپنے اس نظریہ کے لیے مواد ہارنلے کے الفاظ میں تلاش کیا ہو۔ ان کے اس نظریہ پر ماہرین نے اظہار خیال کیا ہے اور بڑی خوبی کے ساتھ اس کی تنقید بھی کی ہے۔ اس ضمن میں حافظ محمود خاں شیرانی، مسعود حسین خاں، گیان چند جین اور شوکت سبزواری اور دیگر کئی ماہرین ہیں جن کے نام قابل ذکر ہیں۔

محمود شیرانی ایسے خیالات کو بطور تبرک تسلیم کرتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی پوری تحریر اور ہندوستان میں مسلمانوں کی مکمل تاریخی ان کے مدنگاہ ہے۔ وہ اس خیال سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں کے برج کے علاقہ کی زبان جب مسلمانوں کے ذریعہ اختیار کی گئی تو اس کی ایک نئی شکل وجود پذیر ہوئی۔ ان کا خیال ہے کہ

---

[۲۴] داستان زبان اردو: ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۔ ۵۵

[۲۵] گوڑی زبانوں کی قواعد: ڈاکٹر ہارنلے،

اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہوگئی تھی جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر توطن اختیار کر لیا تھا۔ ان باتوں کے حوالے سے ان کا اشارہ اکبر سے کئی صدی پیشتر فتح سندھ اور غزنویوں کے فتح پنجاب کے واقعات کی جانب ہے۔ واضح ہو کے اس گفتگو کے وسیلے سے شیرانی اپنے مستقل موضوع پر آنا چاہتے ہیں اور مذکورہ خیالات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب ہم اردو کے ڈول اس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے اور برج بھاشا کا رنگ اور ہے دونوں کے قواعد وضوابط واصول مختلف ہیں۔ اردو برج بھاشا کے مقابلہ میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت قریبہ رکھتی ہے۔ برج سے چند ترمیمیں قبول کر لینا دوسری بات ہے۔ لیکن جہاں برج سے اس نے الفاظ مستعار لیے ہیں وہاں برج پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ اور برج پر کیا موقوف ہے ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اردو کے پرتو سے خالی نہیں ہیں۔''[۲۶]

مسعود حسین خاں کا شمار بیسویں صدی کے ماہرین لسانیات میں سر فہرست ہوتا ہے۔ انہوں نے برج بھاشا اور اردو کے تعلق سے چند بہت پتے کی باتیں بیان کی ہیں۔ موجودہ متھرا کا علاقہ برج بھاشا کا مرکزی علاقہ کہلاتا ہے۔ آج سے تقریباً ہزار بارہ سو سال قبل شورسینی اپبھرنش کا علاقہ بھی یہی تھا۔ شورسینی اپبھرنش جدید ہند آریائی عہد میں داخل ہوتے ہی مختلف بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ بعد میں گریرسن نے مذکورہ اپ بھرنش کی پانچ بولیوں کی نشاندہی کی اور انہیں ایک گروہ میں رکھ کر مغربی ہندی کا نام دیا۔ یہ بولیاں مغربی اتر پردیش میں رائج ہیں اور چوں کہ اردو زبان کی بنیاد اسی علاقے کی کسی ایک بولی پر ہے۔ زبان کی تاریخ سے دل چسپی رکھنے والے ایک عام آدمی کے لیے یہ امر بہت ہی مبہم ہے۔ مسعود حسین خاں نے ان لطیف لسانی نکات پر بہت توجہ صرف کی ہے۔ سب سے پہلے آزاد کے مذکورہ خیال کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

---

۲۶ پنجاب میں اردو: محمود شیرانی، ص۔ ۲۷

''آزاد شمالی ہند کی بولیوں کے باریک اختلاف سے ناواقف تھے اسی لیے
انہوں نے اردو کا ماخذ اپنے پیش رؤں کی طرح برج بھاشا کو بتایا ہے۔'' ۲۷

کوئی بھی زبان صرف اپنی ساخت، سرشت اور بنیاد سے پہچانی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اسماء، افعال اور ضمائر اور اس کے الفاظ کا لہجہ بھی ممد و معاون ہوتا ہے۔ مسعود حسین خاں نے اردو اور برج کی ساخت کو ان کی صوتی، صرفی اور نحوی سطح پر دیکھنے اور دونوں زبانوں کی خصوصیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں تین برج، بندیلی اور قنوجی کا اختصاص اسما، افعال اور صفت کا اختتام پر (اُو یا اَو) ہے، جب کہ دو بولیوں کھڑی اور ہریانوی (اَ) کی خصوصیت رکھتی ہیں۔ ان کے مطابق اردو اور برج بھاشا میں بعض صوتی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ برج بھاشا میں اسما، افعال اور صفات کا اختتام عموماً (اُو) پر ہوتا ہے۔ مثلاً اپنا کی جگہ (اپنو)، چلا کی جگہ (چلیو) گھوڑا کی جگہ (گھوڑو) وغیرہ۔ کھڑی بولی کا معیاری لہجہ برج بھاشا کا تتبع کرتا ہے مثال کے طور پر کڑی بولی کے دیہاتی علاقوں میں پَیسہ کی جگہ پِیسہ بولتے ہیں۔ اردو زبان میں برج کے اثر سے پَیسہ رائج ہے۔

اردو زبان اور اردو لسانیات کے موضوع پر شوکت سبزواری کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں ہیں جن کے مطالعے سے ان کی غیر معمولی لسانی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ متذکرہ بالا بزرگوں کے علاوہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بھی اپنی تصنیف ''داستان زبان اردو'' میں اردو سے متعلق مختلف نظریات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کے آغاز کے سلسلے میں اب تک دو طرح کے یعنی سنجیدہ اور غیر سنجیدہ نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد حافظ محمود خاں شیرانی کے خیال کو وہ سنجیدہ نظریات کے خانہ میں جگہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سنجیدہ نظریے دو ہیں۔ اردو برج سے ماخوذ ہے اسے اردو میں سب سے
پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے پیش کیا۔ اردو اصلاً پنجابی ہے اس کا بڑا اور اہم
سرمایہ پنجابی سے لیا گیا ہے یہ مولانا حافظ محمود خاں شیرانی کا نظریہ ہے۔'' ۲۸

---

۲۷ مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خاں، ص۔ ۱۸۸

۲۸ داستان زبان اردو: ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۔ ۳۷

اس طرح کے نظریات سے شوکت سبزواری اتفاق نہیں رکھتے بلکہ ان زبانوں کے صرفی ،نحوی اور صوتی سرمایہ کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں۔اوراس کے ذریعے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کے اردو کا برج سے کس نوعیت کا رشتہ ہے۔انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے بے حد قریب ہیں۔ان کی مشابہتوں کو دیکھ کر یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اردو برج کی ارتقا پذیر شکل ہے اوران کے مابین ماں بیٹی کا رشتہ ہے۔ان دونوں زبانوں کی مشابہتیں انہیں ایک دوسرے سے قریب ضرور لاتی ہیں لیکن ان کے درمیان دو بہنوں کا رشتہ ہے۔ان کے طریقۂ تقابل اوراس سے برآمد نتائج کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں کیوں کہ موصوف نے تقریباً مسعود حسین خاں جیسا ہی رویہ اختیار کیا ہے جسے سطور بالا میں پیش کیا جا چکا ہے۔اس لیے ان کی تمام گفتگو کی تفصیل کے بجائے اجمال پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

متذکرہ تفصیلات کی روشنی میں ہمارے سامنے اس عہد کا منظر نامہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اردو کے آغاز وارتقا کے متعلق کس نوعیت کا تصور عام تھا۔جیسا کہ گذشتہ صفحات میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ ذرا سی تبدیلی کے ساتھ محمد حسین آزاد خود کو متعارف کراتے ہیں اوراس سلسلے میں ایک مختلف روش اختیار کرتے ہیں۔یہاں مولانا محمد حسین آزاد کے خیال سے متعلق ماہرین کی گفتگو کے اختتام پر اپنے عہد کے ماہر محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر گیان چند جین کے ایک مضمون ''اردو کے آغاز کے نظریے'' کا جس میں انہوں نے اس موضوع کا واضح خاکہ پیش کیا ہے،ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے ان کے مطابق:

> ''محمد حسین آزاد ہارنلے اور میر امن دونوں سے متاثر ہوئے۔ہارنلے کے اثر سے انہوں نے ''آب حیات'' کی بسم اللہ ہی اس قول فیصل سے کی ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔''اور میر امن کی تقلید میں کہا کہ بیرونی مسلمانوں اور ہندوؤں کی زبان کے میل جول سے اردو پیدا ہوئی اس کی تکمیل شاہ جہاں کے عہد میں ہوئی لیکن ارتقا اس سے پیشتر ہوا۔''[۲۹]

---

[۲۹] مشمولہ اردو زبان کی تاریخ: مرزا خلیل احمد بیگ،ص۔۴۲

اب تک کی گفتگو کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس باب میں انیسویں صدی میں اشاعت پذیر ہوئی تقریباً ایسی تمام تحریروں کا ذکر کیا گیا جن میں اردو زبان کے آغاز سے متعلق موضوع کو بحث بنایا گیا ہے۔اس باب کے ابتدا میں ہی ایسی تمام تحریروں کی درجہ بندی پیش کی گئی ہے۔اس سلسلے میں یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ متذکرہ علما کے نظریات کے تسلسل میں چند اور تحریریں بھی شامل کی جاسکتی ہیں۔لیکن ان میں قباحت یہ ہے کہ یہ تحریریں ایک جانب خیال کی رو سے یکسانیت تو رکھتی ہیں یعنی اردو زبان مسلمانوں کے عہد میں مختلف بولیوں کی آمیزش سے وجود میں آئی ہے، لیکن زمانی اعتبار سے ان کا شمار بیسویں صدی کی تحریروں میں ہوتا ہے۔ان تحریروں یا تصانیف میں کم از کم تین نام اہم ہیں جنھیں شامل کیا جاسکتا تھا۔اول سیّد شمس اللہ قادری کی ''اردوئے قدیم'' جو خیال کے اعتبار سے محمد حسین آزاد کے نظریہ کے توسیع یا تقلید ہے۔دوم سیّد سلیمان ندوی کا نظریہ جسے انہوں نے ۱۹۳۹ء میں نقوش سلیمانی میں پیش کیا تھا۔اور سید نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ جس کی رو سے ہم یہ جانتے ہیں اردو دکن میں پیدا ہوئی۔ان تحریروں کو آیندہ صفحات میں موضوع بحث بنایا جائے گا۔اس طویل گفتگو میں اکثر و بیشتر اردو کی ابتدا اور اس کی تاریخ سے متعلق کچھ باتیں بحث میں آئیں لیکن وہ بہر حال تشنہ اور نامکمل ہیں۔اس لیے یہاں یہ امر وضاحت طلب ہے کہ اردو زبان کی مسلمہ حقیقت کیا ہے؟ اردو کس طرح سے اپنے تشکیلی دور کے مختلف مراحل سے گذری؟ اردو زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقا کے واضح خطوط قایم کرنے کے لیے ہمیں ہندوستان کی تاریخ کے چند اہم موڑ پہ بھی نگاہ ڈالنی ہوگی۔

دوسرے باب میں اردو زبان کے لسانی ارتقا کے حوالے سے چند باتیں پیش کی جا چکی ہیں اس لیے تکرار سے احتراز برتتے ہوئے ہم صرف چند اشاروں سے پر ہی اکتفا کریں گے۔ ۱۰۰۰ء تک ہند آریائی زبان اپنی تاریخ کے نئے دور جدید ہند آریائی دور میں داخل ہو چکی تھی۔ پراکرتوں کا دور ختم ہو چکا تھا۔علاقائی اپبھرنشوں سے گذر کر پراکرتیں جدید ہند آریائی زبانوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔سنسکرت زبان بالکل مردہ نہیں ہوئی تھی بلکہ قدیم ادب کے ذخیرہ کی شکل میں اس کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔شورسینی اپبھرنش کے بعد آہستہ آہستہ جس زبان کے خط و خال نمایاں ہونا شروع ہوئے اور جو زبان پورے دوسو

سال تک شمالی ہند میں ابھرتی رہی وہ اردو ہی تھی جس کے باقاعدہ آغاز وارتقا کی تاریخ ۱۱۹۲ء قرار پاتی ہے۔دراصل ۱۱۹۲ء میں دہلی میں مسلمانوں کی آمد، ہندوستانی زبان کی تاریخ بلکہ جدید ہند آریائی کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔لیکن اس کے باوجود یہ خیال درست نہیں کے اردو کی پیدائش کے اصل ذمہ دار مسلمان ہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ ۱۱۹۲ء کے بعد جدید ہند آریائی زبانوں کی ترقی کی رفتار تیز ہوگئی اور آہستہ آہستہ اس زبان پر نکھار آنے لگا۔چوں کہ مسلمان بحیثیت فاتح ہندوستان میں وارد ہوئے اور وہ جس زبان کو اپنے ساتھ لائے وہ یہاں کے مفتوح قوم پر مختلف زاویے سے اثر انداز ہوئی ۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی آمد نے ہندوستان میں جدید ہند آریائی زبانوں کی ارتقاء کی رفتار تیز کردی۔اس عہد کی ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کے متعلق سنیتی کمار چٹرجی جو ہند آریائی زبانوں کے ماہر ہیں ان کا یہ خیال ہے کہ:

''اگر ترکی اسلامی فتوحات نہ ہوتیں تو بھی جدید ہند آریائی زبانیں وجود میں آتیں لیکن اس کا احساس بہت دیر میں ہوتا کہ وہ سنجیدہ ادبی مقاصد کے لیے بھی استعمال ہوسکتی ہیں۔'' [۳۰]

شمالی ہند میں گیارہویں اور بارہویں صدی کے دوران جو زبان ارتقا پذیر تھی اسے ماہرین نے ما قبل اردو (Pre Urdu) سے یاد کیا ہے۔اور اس کے بعد اردو کے باقاعدہ آغاز کی تاریخ ۱۱۹۲ء تسلیم کی ہے۔یہی فتح دہلی کی تاریخ ہے۔چوں کہ مسلمانوں نے پنجاب سے آکر دہلی میں توطن اختیار کیا تھا اور ان میں پنجاب کی زبان بولنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ساتھ ہی ان آنے والوں میں مختلف زبانیں یعنی ترکی، فارسی اور عربی بولنے والے بھی شامل تھے۔اس وقت دہلی اور نواح دہلی میں چار بولیاں ہریانی، کھڑی، برج اور میواتی رائج تھیں۔مختلف قسم کی مقامی اور غیر مقامی لسانی اثرات یا امتزاج کے باعث بنیادی زبان میں فطری تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اور اس کی ایک نئی شکل معرض وجود میں آئی۔ظاہر ہے یہ اردو کی ابتدائی شکل تھی جسے مختلف زمانے میں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔اس امر کی وضاحت آئندہ کی جائے گی۔بہر حال شمالی ہندوستان میں پوری ایک صدی مکمل کر لینے کے بعد یہی زبان ۱۲۹۴ء میں

---

[۳۰] ہندی اور ہند آریائی : سنیتی کمار چٹرجی،ص۔۹۵

دکن پہنچتی ہے جہاں اورنگ زیب کے وفات تک آزادانہ طور پر پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے۔اس طرح سترہویں صدی کے مکمل ہونے تک اردو اپنے لسانی ارتقا کا ایک دور پورا کر لیتی ہے۔اس کے بعد اٹھارہویں صدی میں یہ ارتقا کے دوسرے دور میں داخل ہوتی ہے جسے اردو زبان و ادب کے عہد زرّیں سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے اور مندرجہ بالاسطور میں بار ہا اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ جو زبان ۱۰۰۰ء کے آس پاس دہلی اور نواح دہلی میں بولی جاتی تھی وہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی شاہ جہاں کے عہد تک پہنچی۔ گذشتہ صفحات میں جن علماء کے خیالات کا ذکر تفصیل سے پیش کیا گیا ہے ان کے مطابق کہ شاہ جہاں کے عہد میں مختلف زبانوں کے اختلاط سے اردو زبان وجود پذیر ہوئی یہ بے بنیاد بات ہے اور لسانی لاعلمی کا نتیجہ ہے۔مختلف زبانوں بلکہ نو واردوں کی زبانوں کے الفاظ نے جدید ہند آریائی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں غیر معمولی اضافہ کر دیا اور اس زبان کی ارتقاء کر رفتار تیز کر دی۔ جہاں تک سوال اردو زبان کے ملواں اور مغلوبہ ہونے کا ہے یعنی یہ زبان سنسکرت، ترکی، کشمیری، چینی، مرہٹی کی آمیزش سے بنی ہے۔اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ لسانیات کی رو سے کوئی بھی زبان ملواں یا مغلوبہ ہو سکتی ہے یا ہوتی ہے۔مثلاً انگریزی زبان مختلف زبانوں جیسے لاطینی، رومن، جرمن، فارسی حتّٰی کہ موجودہ زمانے میں ہندی اور اردو کے الفاظ موجود ہیں اور شامل کئے جا رہے ہیں۔اس اعتبار سے انگریزی ایک مغلوبہ زبان ہے لیکن ذخیرہ الفاظ کی حد تک نہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے۔کسی بھی زبان کی ساخت یا جڑ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی زبان میں پیوست ہوتی ہے اور وہی اس زبان کی اصل ہوتی ہے۔اگر چہ اردو زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ موجود ہیں اور گڈمڈ ہو گئے ہیں۔لیکن اس زبان کی ساخت کی جڑیں بہت دور ہند یورپی تک پیوست ہیں۔ امتداد زمانہ نے ہند یورپی خاندان کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا جس کی ایک شاخ ہند آریائی کی شکل میں ہندوستان آئی اور ہندوستان میں تلگو، ملیالم اور تامل زبانوں کو چھوڑ کر آج اسی قوم کی بولیاں رائج ہیں۔

ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ اکبر اور شاہ جہاں کے درباروں سے زبان اردو کی پیدائش کا تعلق بے بنیاد حقائق پر مبنی ہے۔ یہاں اس نوع کی باتیں صرف اس حد تک تسلیم کی جا سکتی ہیں کہ اردو کو دہلی کے

درباریوں، فوجیوں اور علماء نے پروان چڑھایا اور اس کی محض پرداخت و پرورش کی نہ کہ زبان کا ڈھانچہ تیار کیا۔ ہاں دہلی اور نواح دہلی کا اس زبان پر خاص اثر رہا ہے۔ چوں کہ اس زبان کو یہ موقع میسر تب آیا جب شاہ جہاں نے اپنا پایہ تخت آگرے سے دہلی منتقل کیا اور دہلی اہل کمالات کا جمگھٹ بنی۔ ایسے میں ڈپٹی نذیر احمد کے مطابق اکبر کے دربار میں رفتہ رفتہ اردو بولی پیدا ہوگئی۔ یہ بات صداقت سے خالی ہے۔ زبان تو ہر عہد میں پروان چڑھتی ہے لیکن اس کا محل خاص ہوتا ہے۔

اس نظریے کو اگر لسانی حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ ایک خالص لسانیاتی مسئلہ ہے۔ جو لوگ علم لسانیات سے واقفیت نہیں رکھتے وہ قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہیں جس کے نتیجے میں غلط فہمیاں عام ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے حضرات اردو کو ایک ''ملواں'' یا ''کھچڑی'' زبان قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق اردو ایک ایسی زبان ہے جو مختلف زبانوں کے الفاظ کے اختلاط و آمیزش کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ جب دو زبانیں آپس میں ملتی ہیں یا ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو ایک تیسری زبان معرض وجود میں آتی ہے۔ ان کے نزدیک اردو زبان کی تشکیل بھی اسی عمل کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ میر امن کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے۔ لیکن لسانی حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی متعدد قوم و نسل کے لوگوں کا باہم ربط و اختلاط ہوتا ہے تو ان کے پاس ان کی اپنی زبان اور اس کی مخصوص ساخت موجود ہوتی ہے۔ ان کی زبانوں کی ایک اصل ہوتی ہے جس سے وہ زبان تشکیل پاتی ہے، ایک اساس ہوتی ہے جس سے اس کا ارتقا عمل میں آتا ہے، ایک بنیاد ہوتی ہے جس پر اس زبان کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر ایک مخصوص و ممیّز زبان ہوتی ہے جس سے ترقی پا کر وہ زبان وجود میں آتی ہے۔ ان مختلف قوموں کی زبانیں اور ان کی خصوصیات بھی مسلم ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ لوگ ایک دوسرے کی زبانوں پر صرف اس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں کہ یہ ایک دوسرے کی زبان کے الفاظ کثرت سے اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کی اپنی زبان کا بنیادی ڈھانچہ یا کینڈا اپنی قدیم زبان پر قائم رہتا ہے۔ اور ان کی زبان کی ساخت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد یہاں کی زبانوں کے ساتھ بھی یہی واقعہ

ہوا۔ یہاں مسلمان فاتح قوم کی حیثیت سے آئے اور اپنے مفتوح کے ساتھ حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے ان سے ہر سطح پہ موافقت قائم کی ۔اس لئے فطری طور پر یہاں جو زبان پہلے سے موجود تھی مسلمانوں نے اسی کو اختیار کیا۔ چوں کہ ابتدا میں درباری زبان فارسی تھی ۔حکومت کا کاروبار اسی زبان میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ متعدد زبانوں کے اختلاط سے ہندوستانی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ لسانیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ زبان اپنی اصل، ساخت، بنیاد اور اپنے اصول وقواعد سے پہچانی جاتی ہے نہ کہ اپنے سرمایۂ الفاظ سے ۔ الفاظ کی آمیزش کے بعد بولیاں زبان کے دھارے میں شامل ہوتی چلی گئیں ۔ فارسی رسم تحریر پہلے سے موجود تھی اور اس میں اتنی گنجائش تھی کے اس نے ان مختلف زبانوں کے الفاظ کو بخوبی اپنی لسانی خصوصیت کے قالب میں ڈھال لیا۔ یہ بات بھی ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ سنسکرت رسم تحریر شاید ان الفاظ کی باریکیوں کی ادائیگی کی متحمل نہیں تھی ۔

اس کے ساتھ ہی دوسری اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ایسے مختلف الفاظ جن کا اشتقاق ایک ہی مادّے سے ہوا ہو وہ اپنے اندر معانی و مفاہیم کی کائنات رکھتے ہیں ۔انہیں ضبط تحریر میں لانے کے لیے جن حروف کا استعمال ہوتا ہے انہیں کسی طور تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔اس طرح ہندوستانی زبان کے لئے وہی فارسی رسم الخط برقرار رہ گیا۔ جہاں تک دیگر زبانوں کے الفاظ اختیار کرنے کا سوال ہے تو اس کی مثال انگریزی میں بھی واضح طور سے دیکھی جا سکتی ہے۔اس میں لاطینی ،فرانسیسی ، جرمن اور اطالوی زبانوں کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ واقعہ دنیا کی تمام زبانوں کے ساتھ پیش آتا ہے ۔ دہلی میں پلنے بڑھنے والی زبان ’’اردو‘‘ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔اس زبان کی ساخت ہند آریائی تھی بس اس نے اپنے الفاظ کے ذخیرہ میں دوسری زبان مثلاً فارسی ،عربی ،ترکی اور سنسکرت جیسی زبانوں کے الفاظ اختیار کر لئے ۔فطری طور پہ ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ کیوں کہ اس عہد میں جن فرمارواؤں کا اقتدار تھا ان کی زبانیں یہاں کی زبان پر اثر انداز بھی ہوئیں اور اس کا اثر بھی قبول کیا۔اس طرح مسلمانوں کی آمد نے جدید ہند آریائی زبانوں کی ارتقا کی رفتار تیز کر دی۔لیکن یہاں یہ کہنا کہ ان مختلف زبانوں کے میل سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی لسانی لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

اردو کے سلسلے میں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ اردو میں اردو زبان سے متعلق آرا پیش کرنے کے علاوہ لفظ 'اردو' کو اسم زبان کی حیثیت سے مستعمل ہونے کی بحث بیشتر تاریخوں میں اٹھائی گئی ہے۔ ''پنجاب میں اردو'' ۱۹۲۸ء سے لے کر ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' ۱۹۹۹ء کے درمیان ایسی متعدد کتابیں ملتی ہیں جن کے مصنفین نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسم زبان کے اعتبار سے لفظ اردو کا استعمال کس نے سب سے پہلے اور کب کیا ہے۔ ہمیں یہاں اس کی مزید تفصیل بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا مقصد بس یہ ہے کہ ''جس زبان کو آج ہم 'اردو' کہتے ہیں پرانے زمانے میں اسی زبان کو ہندوی، دہلوی، گجری، دکنی اور پھر ریختہ کہا گیا ہے۔ 'اردو' ان میں نسبتاً نوعمر نام ہے۔ زبان کے لحاظ سے یہ تمام نام تقریباً اسی ترتیب سے استعمال میں آئے ہیں''۔[۱۳۱]

●●●

---

[۱۳۱] اردو کا ابتدائی زمانہ: شمس الرحمٰن فاروقی، ص۔ ص ۔۱۲

# باب چہارم

## اردو کی لسانی تاریخیں: بیسویں صدی کے نصف اول میں

اردو زبان کی با قاعدہ اور مربوط تاریخ نویسی کی داستان بہت مختصر ہے۔ بحیثیت مجموعی اگر اس پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ کل ملا کر دوسو سال یعنی انیسویں اور بیسویں صدی کو محیط ہے۔ اردو کی تاریخ سے متعلق انیسویں صدی میں جتنی تحریریں دستیاب ہیں پچھلے باب میں ان کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ہم نے یہ دیکھا کہ انیسویں صدی میں جو تحریریں ملتی ہیں ان میں نہایت ہی سرسری رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن بیسویں صدی میں با قاعدہ طریقہ سے نظریات اور مباحث کا سلسلہ شروع ہوا اور اردو زبان پر لسانی تاریخیں وجود میں آئیں۔ بیسویں صدی نئے علوم اور تصورات کی صدی ثابت ہوئی۔ اردو کی با قاعدہ لسانی تاریخ کی ابتدا حافظ محمود خاں شیرانی کی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' کے منظر عام پر آنے کے بعد سے ہوتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے زبانوں پر غور وخوض کا سلسلہ ۱۷۸۶ء میں سر ولیم جونس کی کوششوں سے شروع ہو جاتا ہے۔ زبان اور اس کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا کون شخص سر ولیم جانس اور ان کے مقالہ کی اہمیت سے اقف نہیں ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام اہل یورپ کو اس مقالہ نے متحرک کر دیا اور اس کے اثر سے ایک طرف زبانوں کی تشکیل نو تو دوسری جانب تقابلی لسانیات کی بنیاد پڑی۔ یہ واقعہ اٹھارہویں صدی عیسوی کا ہے لیکن اس کے باوجود انیسویں صدی میں اردو سے متعلق سوائے چند تحریروں کے کوئی بھی با قاعد تصنیف منظر عام پر نہیں آئی۔ مذکورہ تحریروں کے حوالے سے اس سے قبل تیسرے باب میں تفصیلی گفتگو پیش کی گئی ہے لیکن اس باب میں ہم بیسویں صدی میں منظر عام پر آئی تحریروں کو موضوع بحث بنائیں گے۔

اردو زبان کی لسانی تاریخ کا کل سرمایہ بیسویں صدی میں ہی وجود میں آیا اور اس شعبۂ علم کو بیسویں صدی میں ہی فروغ حاصل ہوا۔ ظاہر ہے اس علم سے کما حقہ واقفیت کے بعد ہی زبان کی پیچیدگیوں اور ان کے مسائل سے نبرد آزما ہوا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بیسویں صدی کی فہرست میں چند ایسی تحریریں بھی شامل ہیں جنہیں انیسویں صدی میں پیش کی گئی تحریروں کی توسیع کہنا نا مناسب نہیں ہوگا۔ چوں کہ خیال کہ اعتبار سے یہ تحریریں پچھلے باب میں بھی شامل کی جاسکتی تھیں لیکن زمانی تسلسل ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں اس باب میں جگہ دی جا رہی ہے۔

## دکن میں اردو (۱۹۲۳ء) : نصیرالدین ہاشمی

اس سلسلے میں سب سے پہلا نام نصیرالدین ہاشمی کا پیش کیا جاسکتا ہے۔ موصوف اردو کے ممتاز محقق اور ماہر دکنیات ہیں۔ ان کی گراں قدر تصنیف ''دکن میں اردو'' کی پہلی اشاعت ۱۹۲۳ء میں عمل میں آئی۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن تقریباً ۱۸۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ موصوف متعدد کتابوں کے مصنف ہیں لیکن ''دکن میں اردو'' ان کی پہلی تصنیف ہے اور اسی نے مصنف کو علمی و ادبی حلقوں میں متعارف کرایا بلکہ اس کے ذریعہ سے مصنف کی ایک شناخت قایم ہوئی۔ اس تصنیف نے اردو کی ادبی تاریخ میں بے حد شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کا عنوان اور صوبوں میں اردو کا نشو نما پر تحقیق و تالیف کے لیے ایک نمونہ بن گیا۔ مصنف کی حیات میں اس کتاب کی کئی اشاعتیں عمل میں آئیں اور تقریباً ہر دفعہ مصنف نے اس میں ترمیم و اضافہ سے کام لیا۔ اس کتاب کی ضخامت بھی کافی حد تک بڑھ کر تقریباً ہزار صفحات تک پہنچ گئی۔ اس طرح اردو سے متعلق جو ان کی رائے تھی اس کا دائرہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ کتاب کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ اس میں جنوبی ہند میں اردو زبان کی ابتدا اور اس کی ترقی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت بھی دراصل اس کے اسی پہلو میں مضمر ہے کہ یہ دکنی ادب کی مکمل تاریخ ہے۔ دکن میں اردو کا حال اور اس کے ارتقا کی تاریخ بیان کرنے میں ہی مصنف نے اپنی پوری توجہ صرف کی ہے۔ اس موضوع پر کام کرتے ہوئے نصیرالدین ہاشمی نے اس کا تناظر بے حد وسیع کر دیا ہے۔ اگر علاقائی اعتبار سے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو دکن کو انھوں نے بڑے وسیع معنوں میں برتا ہے۔ تامل ناڈو، کیرالہ اور آندھرا تمام علاقے اس کتاب کے صفحات کی زینت بنے ہیں۔ حالاں کہ بعد میں اس کتاب سے انھوں نے کچھ مواد الگ کر کے ''مدراس میں اردو'' کے نام سے ایک مستقل کتاب شایع کر دی۔ اس کے علاوہ دکن کے اردو کی چھٹی اشاعت میں ''آندھرا میں اردو'' کے نام سے ایک جدید باب کا اضافہ کر دیا تھا۔

دوسری جانب ''دکن میں اردو'' کی داستان بیان کرنے کا جواز یہ تھا کہ سب سے پہلے ۱۲۹۴ء میں علاء الدین خلجی نے دکن پر اپنا تسلط قائم کیا اور پھر اس کے بعد اس کے سپہ سالار ملک کافور نے پے در پے کئی کامیاب حملے کئے اور اس کے مشن کو آگے بڑھایا۔ خلجیوں کے بعد محمد بن تغلق نے ۱۳۲۷ء میں دکن پر چڑھائی کی اور بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر دیوگیری کو دولت آباد سے موسوم کر کے اپنی دارالحکومت قرار دیا اور یہ اعلان عام کیا کہ رعائے دہلی مع ان قصبات کے لوگوں کے جو چار چار کوس کے اندر واقع تھے تمام و کمال امیر وغریب پیر وجوان مع زن و بچہ کنیز وغلام دولت آباد کی طرف کوچ کریں۔ شاہی فرمان اس قدر سخت تھا کہ حکم ملتے ہی اس کی تعمیل شروع ہوگئی۔ اس طرح عوام اور خواص کی ایک بڑی تعداد شمالی ہند سے جنوبی ہند میں منتقل ہوگئی۔ تاریخ کا یہ ایک بڑا واقعہ تھا اس کے اثر سے سماجی اور لسانی تبدیلیاں رونما ہوئیں جو ایک نئی زبان کے وجود کا سبب بنی۔ اس کے علاوہ اس عہد میں صوفیا اور مذہبی پیشواؤں نے زبان کی ترویج و ترقی کے لیے کس طرح کا کردار ادا کیا ان تمام واقعات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کو سات ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اس کے علاوہ موضوع کا مزید احاطہ کرنے کے لیے کئی ذیلی ابواب بھی قایم کئے گئے ہیں۔ بہمنی سلطنت اور اس کی بعد کی چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں یعنی قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، برید شاہی اور عماد شاہی کے سلاطین نے اردو کی ترویج واشاعت میں کس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان تمام عہد کے شعرا اور نثر نگاروں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح تقریباً تیرہویں صدی عیسوی سے بیسویں صدی کے وسط تک کی اردو کی تاریخ کا احاطہ کرتے ہیں اور اپنی زندگی کے آخری ایاّم تک جتنے ادارے اور انجمنیں اخبار ورسائل اردو کی ترقی میں فعال رہے سب کا حال انہوں نے بیان کیا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستند مواد کی تلاش وجستجو کے بعد انہیں مرتب کیا گیا ہے۔ بلکہ واقعی یہ تالیف مصنف کی مسلسل اور طویل مشقت کا ثمرہ ہے۔

نصیر الدین ہاشمی کا نام عام طور پر علمی حلقوں میں دو حوالوں سے مشہور ہے۔ اول دکنی ادب کی تاریخ کے مولّف کی حیثیت سے جس کا تفصیلی خاکہ پیش کیا گیا دوم دکن میں اردو کی ابتدا سے متعلق نظریہ پیش کرنے کی وجہ سے۔ اس گفتگو کا براہ راست تعلق اس کتاب کے موضوع سے نہیں ہے بلکہ اس کے چند

ابتدائی صفحات سے ہے جس میں مصنف کا ایک مقدّمہ اوراس کے علاوہ اردو زبان سے متعلق ایک تمہید شامل ہے۔مقدمہ میں انہوں نے تمثیل کے پیرائے میں دکن میں اردو کی ابتدا،شمالی ہند میں اردو کے اولین نقوش اورنشو نما، ولی کا شمالی ہند کا سفر،دوآبہ میں اردو کی ترویج واشاعت اوردکن میں اس کی ترقی کا حال بیان کیا ہے۔اورتمہید کے کےطور پر جنوبی ہند میں اردو کی ابتداوراس کی ترقی پر ایک تمہیدی گفتگو پیش کی ہے۔جیسا کہ ذکر ہوا کہ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں منظر عام پر آئی تھی اس لیے''دکن میں اردو کی ابتدا'' کو اردو سے متعلق مختلف نظریے جن کا ذکر آگے کیا جائے گا ان پر تقدم زمانی حاصل ہے۔سردست اس حقیقت کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے''دکن میں اردو کی ابتدا'' سے متعلق نصیرالدین ہاشمی کا کوئی نظریہ نہیں ہےلیکن علمی حلقوں میں ان کا نام اس حوالے سے خاصہ مشہور ہے۔بہر حال بعد میں اس کتاب کے مختلف ایڈیشن شائع ہوئے اس درمیان مولانا شیرانی کی تصنیف''پنجاب میں اردو'' اورسید سلیمان ندوی کے مقالات کا مجموعہ''نقوش سلیمانی''،جس میں انہوں نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ اردو کا ہیولیٰ وادی سندھ میں تیار ہوا،کی اشاعت عمل میں آچکی تھی اور یہ سب نصیرالدین ہاشمی مرحوم کے پیش نگاہ تھیں۔ان کے علاوہ مختلف ماہرین لسانیات مثلاً جیولس بلاک، پروفیسر ٹرنر، پروفیسر گراہم بیلی، پروفیسر چٹرجی وغیرہ کی آرااور سیّدمحی الدین قادری زور کی تحقیقات کا نتیجہ کہ''اردو کا سرچشمہ وہ زبان ہے جو پنجابی اور برج بھاشا دونوں کی ماں تھی''، سے واقف تھے۔یعنی یہ مکمل منظر نامہ مصنف کے پیش نظر تھا۔یہاں مصنف کے خیال کی وضاحت کے لیےاس کتاب سے ان کے جستہ جستہ الفاظ اوراقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

''جب ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ بودوباش اختیار کرتی ہےتو یہ امر ناگزیر ہے کہ بول چال اور کام کاج میں ایک کے الفاظ دوسرے کی زبان میں منتقل ہوں۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس نصیرالدین ہاشمی کے خیال کی تفہیم کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔مصنف اسے تاریخ کی روشنی میں حل کرتے ہوئے اپنے مدعا پر آنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا خلاصہ یوں بیان

---

[1] دکن میں اردو : نصیرالدین ہاشمی،ص۔۳۱

کیا جا سکتا ہے ۔موصوف ہندوستان کی قدیم تاریخ کی تصویر پیش کرتے ہیں اور یہ باور کراتے ہیں کہ آریوں کی زبان سنسکرت جو اتنی اہم تھی اس میں بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناگزیر تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ۔اس زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے باشندوں میں کچھ کے کچھ ہو گئے اور ہوتے ہوتے پراکرت زبان خود پیدا ہوئی ۔اور پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ پراکرت زبان ہی کل شاہی دفاتر اور دربار کی زبان ہوگئی ۔ان میں پانچ پراکرتیں قابل ذکر ہیں پالی، جینی، مہاراشٹری، سوراسنی اور مگدھی ۔سوراسنی کا دوسرا نام برج بھاشا ہے ۔یہ زبان بہت وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی ۔سندھ سے بہار اور لاہور سے مالوہ تک اس کی وسعت تھی اردو زبان کا مخرج اسی برج بھاشا کو قرار دیا گیا تھا مگر جدید تحقیقات کی رو سے یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے ۔آگے چل کر اردو کی ابتدا کے متعلق مختلف مشہور نظریوں مثلاً پنجاب میں اردو، سندھ میں اردو، دکن میں اردو اور دوآبہ گنگا و جمنا میں اردو کی ابتدا کا ذکر کرتے ہیں ۔دراصل مصنف اردو سے متعلق ایک وسیع تناظر قائم کر کے اپنی بات پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ:

> ''یہ امر تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے ۔اس لیے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہوسکتا ۔کیوں کہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے ان ہی مقامات پر ہوئی ۔''[۲]

وہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ۷۱۲ء میں سندھ میں اسلامی حکومت کے آغاز اور مسلمانوں کی مدتوں کی حکومت اور اس کی رواداری اور ہندو مسلمان کے اختلاط کی وجہ سے ایک نئی زبان وجود پذیر ہوسکتی ہے ۔لیکن بعض تحقیقات کی روشنی میں اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے ۔کیوں کہ ان کا ماننا ہے کہ فاتحوں کی اصلی زبان عربی تھی اس لحاظ سے جو زبان عالم وجود میں آئی وہ عربی اور سوراسنی (سورشینی) سے مشترک ہوتی ۔مگر چوں کہ اس میں فارسی کا حصہ زیادہ ہے اس لیے ان کا خیال ہے کہ اردو کی ابتدا سندھ سے نہیں ہوئی ۔بلکہ سندھ کے بعد مسلمانوں کی آمد سواحل ملیبار اور کرناٹک پر ہوئی ۔شیوخ عرب اور سرداران آل ہاشم

---

[۲] دکن میں اردو : نصیر الدین ہاشمی، ص۔۳۲

تجارت اور تبلیغ دین کی دھن میں صد ہا میل سمندر کی راہ طے کر کے پرامن طریقے سے سواحل ہند پر پہنچے اور اپنی کوشش وجدّ وجہد سے سواحل کے ہندوؤں پر خاص رسوخ حاصل کرلیا۔ آ گے لکھتے ہیں کہ:

''یہ امر غور طلب ہے کہ جب مسلمانوں نے مدتوں دکن میں بود و باش کی اور حکومت قایم کی، تجارت کی، مذہب کی اشاعت اور تعلیم دی۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا یہاں کے ملکی اور دیسی باشندوں کے ساتھ تھا۔ ہر وقت کام کاج خرید و فروخت سے سابقہ رہتا تھا تو ظاہر ہے کہ ایک خاص زبان کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ جو دونوں قوموں کے لیے تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہوتی۔ اس لحاظ سے جو دعویٰ اردو کے دکن میں پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے وہ بہت بڑی حد تک صحیح ہوسکتا ہے مگر جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے میں مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع نظر آتے ہیں۔ اس لیے سر دست ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے۔''[۳]

مصنف نے اردو کی ابتدا کی ایک شکل متعین کرنے کے لیے مختلف نظریوں کا ذکر کیا ہ اور ایک طویل تمہید اختیار کی ہے۔ لیکن پھر وہ ایک ایک کر کے ان تمام نظریوں سے تردید کرتے ہیں۔ آخر میں ان کی نگاہ دوآبہ گنگا اور جمنا والے نظریہ پر ٹھہرتی ہے جسے اردو زبان کا مولد قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ:

''مسلمان فاتحین شمال کی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو اول انہوں نے پنجاب میں قیام کیا۔ مگر اس کے بعد دہلی کی جانب پیش قدمی کی۔ مسلمانوں کے صد ہا خاندان جو ترک، مغل اور افغان تھے جن کی زبان عام طور پر زیادہ تر فارسی تھی۔ پنجاب سے لے کر دہلی تک آباد ہو گئے۔ اس زمانہ میں یہاں ''جدید ہند و آریائی دور کی پراکرت'' زبان

---

[۳] دکن میں اردو : نصیر الدین ہاشمی، ص۔۳۵

بولی جاتی تھی اس دیسی زبان میں غیر ملکیوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی
اور اس امتزاج سے اردو کی پیدائش ہوئی۔''[۲]

اردو کی پیدائش سے متعلق ایک حتمی نتیجے تک پہنچنے کے بعد ایک مرتبہ پھر تاریخ کی طرف لوٹتے ہیں۔ ۱۱۹۲ء سے ۱۲۹۴ء تک یعنی صرف سو سال میں برج کے علاقہ میں مسلمانوں کی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی تھی کہ انہوں نے جنوبی ہند کا رخ کیا۔ محمد بن تغلق نے دکن پر فوج کشی کی اور دیوگیری کو دولت آباد سے موسوم کر کے اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں یہ ذکر کیا گیا کہ فرمان شاہی کے بعد اہل علم و فضل، اہل حرفہ اور اہل تجّار سبھی دہلی چھوڑ کر دکن منتقل ہو گئے۔ یہ فاتح جو زبان اپنے ساتھ لے کر آئے وہ یہاں دکن میں آزادانہ طور پر نشو نما حاصل کرنے لگی۔ اس کے مقابلے میں اس پلّے کی اور کوئی دوسری زبان مزاحم بھی نہیں تھی۔ اور اس طرح مصنف نے دکن میں اردو کے آغاز اور اس کے ارتقاء کی تاریخ مرتب کرنے کی بنیاد حاصل کر لی۔ دراصل اردو زبان سے متعلق نصیر الدین ہاشمی کا یہی نظریہ ہے جس کی تعبیر مختلف طریقہ سے پیش کی جاتی رہی ہے۔

عام طور پر لوگ دکن میں اردو زبان کی ابتدا سے متعلق نظریہ کو نصیر الدین ہاشمی سے منسوب کرتے ہیں جب کہ مصنف نے دوٹوک طریقہ سے یہ بات کہیں نہیں لکھی ہے کہ اردو زبان کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ ہم نے گذشتہ صفحات میں ان کی تحریر کے متعدد اقتباسات من و عن اس لیے پیش کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ حقیقت حال کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ موصوف نے اس نظریہ کا اگر کہیں ذکر بھی کیا ہے تو اس کا الزام براہ راست اپنے سر نہیں لیا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مصنف کے الفاظ کو بہ دقّت ایک شکل دے کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے ورنہ حق بات یہ ہے کہ موصوف اس موضوع کو بیان کی کثرت میں الجھا دیتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بیشتر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو کی ابتدا کا نظریہ پیش کیا ہے۔ دوسری جانب کمال حیرت کا مقام ہے کہ گیان چند جین جیسے ماہر زبان نے اپنے ایک مضمون ''اردو کے آغاز کے نظریے'' اور مرزا خلیل احمد بیگ جن کی اردو لسانیات پر منفرد شناخت ہے، نے بھی

---

[۲] دکن میں اردو : نصیر الدین ہاشمی، ص۔ ۳۶

اپنے مضمون ''اردو کے آغاز وارتقا کے نظریے'' میں کے۔ایس۔بیدی کی کتاب ''تین ہندوستانی زبانیں'' کے حوالے سے یہ لکھتے نظر آتے ہیں کہ نصیر الدین ہاشمی نے اردو کی ابتدا دکن سے کی ہے۔لیکن آمنہ خاتون نے ایک طویل اقتباس کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی ہے اور اور لکھتی ہیں کہ:

''حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ علمی دنیا میں بھی ایسی غلط فہمیاں کس طرح پیدا ہو جاتی ہیں اور نہ صرف یہ کہ پیدا ہو جاتی ہیں بلکہ اس حد تک مشہور ہو جاتی ہیں کہ سچ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی نے یہ قطعاً نہیں کہا کہ اردو کی ابتدا دکن سے ہوئی پھر بھی لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ نصیر الدین ہاشمی دکن کو اردو کا مولد قرار دیتے ہیں۔''[5]

اردو کی ابتدا سے متعلق اس نوع کی تحریروں کی کثیر تعداد ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں جتنے تذکرے اور اردو ادب کی تاریخیں شایع ہوئیں ان سب کے مصنفین نے اردو زبان کی ابتدا اور اس کے ارتقا سے متعلق چند ابتدائی صفحات مختص کر دیے۔اگر سرسری طور پر ان ناموں پر نگاہ ڈالی جائے مثلاً نصیر الدین خاں خیالؔ کی ''داستان اردو'' (۱۹۱۶ء)، مولوی یحییٰ تنہا کی ''سیر المصنفین'' (۱۹۱۶ء)، رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' (۱۹۲۸ء)، اور سیّد حامد حسن قادری کی ''داستان تاریخ اردو'' (۱۹۴۱ء) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ایسی تصانیف کو موضوع بحث بنانے کے لیے ہمیں دو باتیں متوجہ کرتی ہیں اول کہ ان تمام مصنفین کے یہاں یہ قدر مشترک ہے کہ ان حضرات نے اردو ادب کی تاریخ رقم کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر اردو زبان کا حال بیان کیا ہے۔دوسرے ہماری لسانی تاریخوں میں ان میں سے صرف چند تصانیف پر ہی اظہار خیال کیا گیا ہے اس لیے ہماری نگاہ فوراً ان کتابوں تک پہنچ جاتی ہے۔لیکن غور کرنے پر اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے اور اس نوعیت کی مختلف کتابیں سامنے آجاتی ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں پیش کیا گیا ہے۔ان میں بیشتر میں سرسری اور سطحی گفتگو پر اکتفا کیا گیا ہے۔ایسی تحریروں کا ذکر نمونے کہ طور پر ہی کیا جا سکتا ہے۔اس لیے بیجا طوالت سے بچتے ہوئے ان میں سے صرف دو تصانیف کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے ان کا ذکر بیشتر لسانی تاریخوں میں بالخصوص ملتا ہے۔

---

[5] اردو زبان کا آغاز مختلف نظریے اور حقائق : ڈاکٹر خورشید حمرا صدیقی ،ص۔۱۷۰

## اردوئے قدیم (۱۹۲۵ء) : سیّد شمس اللہ قادری

''دکن میں اردو'' کی اشاعت کے بعد حکیم شمس اللہ قادری کی تصنیف ''اردوئے قدیم'' ۱۹۲۵ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا پورا نام تاریخ زبان اردو یعنی اردوئے قدیم ہے۔ اس میں اردو زبان اور اس کی نظم و نثر کی مفصل تاریخ، عہد بعہد ترقیوں کا تذکرہ ابتدائی زمانہ سے بارہویں صدی ہجری کے نصف اول تک مذکور ہے۔ اور اس کے ساتھ قدیم شعراء اور مصنفین کے معتبر حالات زندگی تحریر ہیں۔ یہ تصنیف مضامین کی شکل میں ۱۹۱۰ء میں ''لسان العصر'' کے چار نمبروں میں شایع ہو چکی تھی بعد میں اسے مصنف نے کتابی شکل دی۔ اس کتاب کی ابتدا میں مصنف نے ہندوستان کی قدیم بولیوں سنسکرت، پراکرت اور بالخصوص سورشینی یعنی برج بھاشا کی بحث اٹھائی ہے اور اردو کے آغاز و ابتدا سے متعلق اپنا خیال پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''زمانۂ حال کی تاریخی اور لسانی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ زبان اردو کا منبع و مخرج برج بھاشا ہے اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ تیرہ، چودہ اور پندرہ اور اسی قبیل کے اور بہت سے الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں وراروچی نے انہیں اپنی گرامر میں بجنسہ بیان کیا ہے۔ مسلمان فاتحوں سے جب ہندوؤں کا میل جول ہوا تو برج بھاشا میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصہ کے بعد زبان کی اصلی ہیئت بدل گئی جس کے باعث ایک جدید زبان کا ظہور ہوا اور یہ جدید زبان سلاطین مغلیہ کے دور میں زبان اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔''[۶]

---

[۶] اردوئے قدیم : سیّد شمس اللہ قادری، ص۔ ۶، ۷

متذکرہ بالا اقتباس کا سلسلہ مولانا محمد حسین آزاد کے خیال سے جا کر ملتا ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ ان کے خیال کی توسیع ہے۔ اس سے قبل برج بھاشا اور اردو زبان کے تعلق سے محمد حسین آزاد کے خیال کے ضمن میں جدید لسانیات کی روشنی میں تفصیلی گفتگو پیش کی جا چکی ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں مزید گفتگو کی گنجائش باقی نہیں بلکہ یہاں اتنا اشارہ ہی کافی ہے کہ یہ دونوں زبانیں یعنی اردو اور برج صوتی، صرفی اور نحوی اعتبار یکسر مختلف ہیں اور دونوں کا رنگ ڈھنگ ایک کو دوسرے سے ممیّز کرتا ہے۔ ایسے خیالات کی اہمیت یہ ہے کہ یا تو انہیں بزرگوں کے تبرک کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے یا پھر نمونے کی حیثیت سے۔ ''اردوئے قدیم'' کی اشاعت کے بعد بھی اس نوع کی تحریروں کا سلسلہ برقرار رہا لیکن ۱۹۲۸ء میں ''پنجاب میں اردو'' اور اس کے فوراً بعد ۱۹۳۲ء میں ''ہندوستانی لسانیات'' کی اشاعت نے اردو زبان سے متعلق تاریخوں کا منظر نامہ ہی تبدیل کر دیا۔ مذکورہ کتابوں کے علاوہ بیسویں صدی کے نصف اول میں دو اور تصانیف منظر عام پر آئیں ان میں پہلی سیّد سلیمان ندوی کی ''نقوش سلیمانی'' ۱۹۳۹ء میں اور مسعود حسین خاں کا مقالہ ''مقدّمہ تاریخ زبان اردو'' جس کی علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔

# نقوش سلیمانی (۱۹۳۹ء) : سیّد سلیمان ندوی

سیّد سلیمان ندوی ہمہ جہت، ممتاز اور نمایاں ترین شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا اصل نام انیس الحسن اور کنیت ابونجیب تھی لیکن وہ سیّد سلیمان ندوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی خدمات علم و ادب کے مختلف شعبوں میں قابل ستائش ہیں۔ سلسلۂ گفتگو آگے بڑھانے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سوانح پر ایک عمومی نگاہ ڈالی جائے۔ ''سیّد سلیمان ندوی ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء میں پٹنہ کے قریب ضلع بہار شریف کے ایک گاؤں دسنہ میں پیدا ہوئے۔ دسنہ بہار کا ایک مردم خیز گاؤں ہے جہاں ہر دور اور ہر زمانے میں حکما، ادبا اور علما پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن عام طور سے وہ لوگ اپنی کم آمیزی اور گوشہ نشینی کی وجہ سے دنیاوی شہرت کے مالک نہ بن سکے۔''[۷] سیّد صاحب نے ابتدائی تعلیم روایتی انداز سے اپنی بستی میں حاصل کی اس کے بعد پھلواری شریف کی خانقاہ میں اور پھر ۱۸۹۹ء میں دربھنگہ کے مدرسہ امدادیہ میں داخل ہوئے۔ غرض سیّد سلیمان ندوی کی ذہانت اور علمی لگن ہر جگہ اکتساب فیض کراتی رہی۔ دسنہ، پھلواری شریف اور دربھنگہ کے ادبی ماحول اور تعلیم و تربیت کے بعد موصوف نے مزید تعلیم کے لیے فروری ۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلما میں داخلہ لے لیا۔ یہاں مختلف استاذوں اور بزرگوں مثلاً مولانا فاروق چڑیا کوٹی اور علامہ شبلی نعمانی کی صحبت اور تربیت نے ان کی شخصیت میں زبردست نکھار پیدا کر دیا اور ان حضرات کی خصوصی توجہات نے سیّد صاحب کے ادبی جوہر کو خوب پروان چڑھایا۔ اس کے علاوہ عبدالماجد دریابادی، علامہ اقبال، مولانا آزاد سے ان کے نہایت قریبی تعلقات نے ان کی فکری جہتوں کو مزید روشن کیا۔

دراصل علمی حلقہ میں ان کی شناخت ایک عربی زبان و ادب کے دانشور کی حیثیت سے ہے۔ لیکن انہوں نے خود کو اسی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ اردو زبان و ادب کی جانب بھی توجہ کی جو ان کی طالب علمی کے زمانے سے ہی دلچسپ موضوع تھا۔ اردو زبان و ادب سے بے پناہ لگاؤ کی وجہ کر انہوں نے اس کے

---

[۷] سیّد سلیمان ندوی: حیات اور ادبی کارنامے : ڈاکٹر سیّد محمد ہاشم، ص۔ ۹، ۱۰

سرمایے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ موصوف تاحیات ادبی اور علمی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ متعلقہ موضوع سے ان کی دلچسپی کے ذکر سے قبل ان کی شخصیت کا اس پس منظر میں محض اس اضافہ کی ضرورت ہے کہ سیّد صاحب اردو زبان کی ابتدا اور نشو نما سے بھی سروکار رکھتے تھے۔ یوں اردو ہی نہیں مجموعی طور پر زبانوں کی حقیقت اور اس کے مطالعے سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ تاہم ایک ماہر لسانیات سے زیادہ ان کی شناخت ایک ناقد، محقق مورّخ اور شاعر وصحافی کی حیثیت سے قائم ہے۔

''نقوش سلیمانی'' ان کے خطبات، مقالات اور مقدّمات پر کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کے کتابی شکل میں منظر عام پر آنے سے قبل ان مضامین کی اشاعت کے سبب لوگ مصنف کے خیالات سے واقف ہو چکے تھے البتہ اس کی اشاعت ۱۹۳۹ء میں عمل میں آئی۔ اس لیے اس کتاب پر یہاں ان دو تصانیف یعنی ''پنجاب میں اردو'' اور ہندوستانی لسانیات'' سے پیشتر گفتگو کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ خیال کی رو سے سیّد سلیمان ندوی کی تحریروں کو تقدم زمانی حاصل ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ یہ کتاب تین ابواب یا حصے یعنی خطبات، مقالات اور مقدّمات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں اردو زبان سے متعلق چھ خطبات شامل ہیں جو ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۷ء کے درمیان ہندوستان کے مختلف مقامات پر دیے گئے تھے۔ یہ مجموعہ چھپنے کے بعد توقع سے زیادہ مقبول ہوا اور ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کر لیا گیا۔ اپنی طرح کی یہ پہلی تحریریں تھیں جن میں اردو کے مولد کی تعیین کی گئی تھی اور اس ضمن میں سندھ اور ملتان کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اردو سے متعلق سلیمان ندوی کے اظہار خیال کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ان کے متعدد خطبات پر مشتمل ہے۔ موصوف کے ان الفاظ کا سیاق خاصا طویل ہے اور اس کی تہ میں ایک مبسوط نظریہ ہے جسے صرف زبان کی تاریخ کے حوالے سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس باب میں مجموعی طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کا نصف اول ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی ہنگامہ خیزیوں کے لیے جانا جاتا ہے۔ سیاست کے اثر سے زندگی کا کوئی شعبہ محفوظ نہیں تھا زبان کا قضیہ بھی ملک میں پوری طرح سر اٹھا چکا تھا۔ اردو زبان کی حیثیت سے ہماری مشترکہ تہذیب کی وراثت، جس کی جڑیں سیکڑوں سال کی تاریخ میں پیوست تھیں اس کی مخالفت شروع ہوگئی تھی۔ سیّد سلیمان ندوی نے بس یہی کیا کہ اس حقیقت کو ایک منطقی

شکل عطا کی جسے آج ہم صرف اردو سے متعلق نظریہ کی حیثیت سے یاد رکھتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ لسانی تاریخ کے ضمن میں شاید اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہو۔ ہمارے علماء نے اسے صرف اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اردو کی ابتدا سے متعلق سیّد سلیمان ندوی کے الفاظ اس طرح ہیں:

''سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ ہے۔ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔''[8]

ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اردو کی تاریخ سے متعلق دو طرح کے رویے عام نظر آتے ہیں۔ اوّل اردو برج سے یا کسی خاص زبان مثلاً پنجابی سے پیدا ہوئی یا دوم کسی مخصوص علاقے میں مسلمانوں کے ربط و ارتباط سے پیدا ہوئی۔ اس نوع کی تحریروں میں عام طور سے اردو کے آغاز و ابتدا کی داستان بہر حال مسلمانوں کی آمد کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد نے ہند آریائی زبانوں کو ایک سمت عطا کی اور ان کے قیام کے ساتھ یہاں کے مختلف علاقوں کی بولیاں چمک اٹھیں۔ لیکن اس زبان کے آغاز و ابتدا کو مسلمانوں کی سکونت پذیری سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ خالص علمی اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے متذکرہ بالا بیان میں ذرا بھی صداقت نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے سندھ کی تہذیب و معاشرت کے علاوہ وہاں کی زبان کو بھی متاثر کیا، لیکن وہ زبان اردو نہیں تھی بلکہ وہ اس زبان کی قدیم شکل تھی جو آج سندھی کہلاتی ہے۔[9] یہی وجہ ہے کہ سندھی زبان میں ہمیں عربی کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔ سندھی زبان پر عربی کا اثر یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے عربی زبان کے رسم الخط کو بھی اختیار کر لیا۔ اس اعتبار سے ہم بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عربوں نے وادیِ سندھ میں اپنے قیام کے دوران کسی نئی زبان کو جنم نہیں دیا بلکہ اس خطۂ ارض میں بولی جانے والی زبان کو متاثر ضرور کیا۔[10] اس

---

۸۔ نقوش سلیمانی : سیّد سلیمان ندوی، ص۔۳۱

۹۔ ہندوستانی لسانیات: سیّد محی الدین قادری زورؔ، ص۔۹۵

۱۰۔ اردو کی لسانی تشکیل: مرزا خلیل احمد بیگ، ص۔۱۴

طرح اس نظریہ کی ماہرین زبان کے ذریعے خوب تردید اور تنقید کی گئی۔ سیّد محی الدین قادری زورؔ نے اپنے ایک مضمون میں سیّد سلیمان ندوی کی تحریروں کے چند اقتباسات کی روشنی میں ان خیالات پر بحث کی ہے۔ وضاحت کی غرض سے وہ اقتباسات یہاں من وعن پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) ''قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔''

(۲) ''اردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا کام نہیں بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کا لازمی نتیجہ ہے۔''

(۳) ''اردو شاہ جہاں کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں، خلجیوں اور تغلقوں کے ہی زمانے میں یہ پیدا ہو چکی تھی۔''

(۴) ''یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔''[۱۱]

سیّد محی الدین قادری زورؔ نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ سید سلیمان ندوی کی یہ تحریریں مختلف اوقات میں یعنی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۷ء کے درمیان لکھی گئیں۔ ان میں پیش کے گئے متضاد بیانات کے نتیجے میں اردو اور ہندی کے ارباب تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ اسی اثنا میں محمود شیرانی کی ''پنجاب میں اردو'' منظر عام پر آئی اور خود موصوف کا تحقیقی مقالہ ''ہندوستانی فونے ٹکس'' کے نام سے ۱۹۳۰ء میں پیرس سے انگریزی زبان میں اور بعد میں اسے اردو میں ''ہندوستانی لسانیات'' کے نام سے شایع کیا گیا اس کے باوجود سیّد سلیمان ندوی اپنے خیال پر قایم رہے۔ اس رویّے پر زورؔ صاحب اپنا ردِّ عمل ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان تحقیقی اور لسانیاتی کتابوں کے مطالعے کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائی۔ یہ لسانیات سے زیادہ تاریخ و ادب و نقد شعر کے ماہر تھے اس لیے اپنے علم و فضل اور وسعت معلومات کے باوجود اس

---

[۱۱] مضمون: اردو کی ابتدا: سیّد محی الدین قادری زورؔ، مشمولہ اردو زبان کی تاریخ: مرزا خلیل احمد بیگ، ص۔ ۱۹

مسئلے سے دور ہو گئے ، یا شاید انہوں نے دوسرے مصنفوں کی تحقیق یا
نظریے سے ہم خیال ہونے کو اپنے تبحر علم کے لیے کسرِ شان تصور کیا۔"[۱۲]

سیّد محی الدین قادری زور اور مرزا خلیل احمد بیگ نے مذکورہ بالا نظریہ پر بطور خاص اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے علاوہ احتشام حسین، گیان چند جین، مسعود حسین خاں اور شوکت سبزواری وغیرہ ماہرین نے بھی اس نظریہ کی تنقید کی ہے۔ تاریخ زبان کا مطالعہ کرنے والے اور اردو کے ماہرین لسانیات کے نزدیک سیّد صاحب کا صرف یہی نظریہ لائق بحث رہا ہے جب کی حقیقت یہ ہے کہ ان کی لسانی فکر کا بھی ارتقا ہوا ہے۔ اردو کے آغاز کے متعلق بعد میں جو سائنسی نظریات سامنے آئے سیّد سلیمان ندوی نے خود کو ان سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی کی۔ ان کی تحریروں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کے اس ضمن میں ان کے یہاں واضح بیانات اور صریح وضاحتیں موجود ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اردو دہلی اور اس کے قرب و جوار میں پیدا ہوئی اور یہ دہلوی ہندی اور ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"آریا جو زبان بولتے ہوئے اس ملک میں آئے معلوم نہیں وہ اس کو کب تک
بولتے رہے۔ بہر حال اس میں میل جول ہوا اور اس سے اتر کر ایک دوسری
زبان کا خاکہ تیار ہوا جو ذرا ذرا سے فرق سے ہر صوبہ میں الگ الگ ہو گئی۔"[۱۳]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہند آریائی زبان کا ارتقائی خاکہ سیّد سلیمان ندوی کے ذہن میں موجود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی تحریروں میں متضاد بیانات موجود ہیں۔ مثال کہ طور پر یہ کہ اردو زبان مسلمانوں کی آمد کے بعد سندھ میں پیدا ہوئی۔ دوسرے یہ کہ مختلف زبانوں کے اشتراک سے وجود میں آئی۔ اور تیسرا یہ کہ دہلی اور اس کے قرب جوار میں پیدا ہوئے۔ اس کے علاوہ اور کئی متضاد باتیں ہیں جنہیں گذشتہ صفحات میں اقتباس کی شکل میں من و عن پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کے خیالات سے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان تحریروں کو ہم اس زمرے میں رکھتے ہیں جس زمرے میں شامل بزرگوں کو الگ سے لسانیات کا کوئی درک نہیں تھا۔

---

۱۲ مضمون: اردو کی ابتدا: سیّد محی الدین قادری زور، مشمولہ اردو زبان کی تاریخ: مرزا خلیل احمد بیگ، ص۔ ۲۰

۱۳ نقوش سلیمانی : سیّد سلیمان ندوی، ص۔ ۳۵۰

# پنجاب میں اردو : ۱۹۲۸ء

اردو میں باقاعدہ لسانی تاریخوں کا سلسلہ حافظ محمود خاں شیرانی کی مشہور تصنیف ''پنجاب میں اردو'' ۱۹۲۸ء کی اشاعت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ موصوف کا معرکہ آرا کارنامہ ہے۔ اس سے پہلے وہ شعرالعجم کی تنقید لکھ کر ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ انہوں نے میر قدرت اللہ قاسم کے ''تذکرۂ شعرائے اردو'' کی بڑی محنت اور جاں فشانی سے تصحیح و اشاعت کی۔ ان کے علاوہ پرتھی راج راسا، فردوسی پر چہار مقالے اور دوسرے بے شمار ادبی، تاریخی اور تحقیقی نوعیت کے مضامین بکثرت لکھتے رہے اور پابندی سے معیاری رسالوں میں انہیں شایع کراتے رہے۔ ان کے مضامین کے متعدد مجموعے ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' کے نام سے کئی جلدوں میں شایع ہوئے ہیں۔ ان کی علمی اور تحقیقی خدمات کی فہرست کافی طویل ہے۔ محمود شیرانی ہماری زبان و ادب کے عظیم محقق اور دانشور تھے۔ ان کی تحقیقات سے جہاں ایک جانب مختلف نئے نئے ادبی و تاریخی حقائق سامنے آئے وہیں دوسری طرف بے شمار مفروضات کا تاریک پہلو روشن ہوا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ علمی حلقہ میں ان کی شہرت ان کی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' کے ذریعے سے زیادہ ہوئی جب کہ بحیثیت مجموعی وہ اردو ادب کی خدمت میں تاحیات ہمہ تن مصروف رہے۔ اس تصنیف پر گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھانے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا مختصر سوانحی خاکہ نقل کر دیا جائے۔

> ''محمود شیرانی پانچ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو ریاست ٹونک راجپوتانہ میں پیدا ہوئے۔ اورینٹل کالج لاہور سے مفتی عبداللہ ٹونکی کی نگرانی میں منشی، منشی عالم اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ پھر انٹرنس پاس کر کے بیرسٹری کی تعلیم کی غرض سے ۱۹۰۴ء میں لندن کے لیے روانہ ہو گئے۔ دو سال کا کورس مکمل کیا تھا کے والد کے انتقال کے باعث تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے ''لوزک اینڈ کمپنی لندن'' میں بطور ماہر عتیقیات ملازم ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء

میں وطن واپس آئے۔۱۹۲۲ء کے شروع میں اسلامیہ کالج لاہور میں اردو
کے لکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
میں تدریسی ذمہ داری سنبھالی اور ۱۹۴۰ء میں ملازمت سے فارغ ہوکر
واپس ٹونک چلے گئے جہاں فروری ۱۹۴۶ء میں ضیق النفس کے مرض سے
انتقال کیا۔'' [۱۴]

اردو کی پیدائش کے سلسلے میں مختلف نظریات پیش کئے جاتے رہے ہیں ان میں ایک نظریہ حافظ محمود شیرانی کا بھی ہے۔ان کی کتاب کے نام ''پنجاب میں اردو'' سے ہی اردو زبان کے آغاز وابتدا سے متعلق ان کا نقطۂ نظر ظاہر ہو جاتا ہے۔اپنی تحقیق کا نتیجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ وہ زبان جسے ہم 'اردو' کہتے ہیں سرزمین پنجاب میں پیدا ہوئی اور وہیں سے ہجرت کر کے دہلی پہنچی۔ یہ تصنیف جس زمانہ میں منظر عام پر آئی علمی حلقوں میں اس کی بڑے زور شور سے پذیرائی ہوئی۔مصنف کے تحقیقی طریقۂ کار اور موضوع سے متعلق استدلال نے معاصرین میں انہیں منفرد مقام دلایا۔شیرانی کی اس تصنیف کی دو طرح سے اہمیت مسلم ہے اول یہ کہ یہ ایک با قاعدہ لسانی تحقیق ہے اور دوم یہ کہ اس سے پیشتر اردو زبان کی جتنی بھی تاریخیں یا تحریریں منظر عام پر آئیں ان میں اردو کا ماخذ دہلی اور نواح دہلی کی زبانیں بتائی گئیں ہیں۔اس موضوع پر پروفیسر شیرانی سے پہلے یا ان کے بعد ان کی تصنیف کی تائید یا تردید وتنقید میں جو کچھ لکھا گیا ان بیانات کا جائزہ لینے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پوری تصنیف پر ایک نگاہ صرف کرتے ہوئے اس کا خاکہ پیش کر دیا جائے۔

یہ کتاب مقدمہ کے علاوہ چھ فصلوں پر مشتمل ہے۔مقدمہ پوری تصنیف کا آئینہ ہے اس میں وجہ تصنیف بھی بیان کی گئی ہے اس کے مطالعہ سے مصنف کا موقف ومنشا بھی واضح طور سے سمجھا جا سکتا ہے۔ پہلے باب میں لفظ اردو کی تحقیق اور اس کے اسم زبان کی حیثیت سے رائج ہونے کی بحث اٹھائی گئی ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے قدیم مصنفین اور شعرا کی تصانیف مثلاً تزک بابری، نوطرز مرصع، باغ و بہار، آثار

---

[۱۴] حافظ محمود شیرانی تحقیقی مطالعے : مرتب پروفیسر نذیر احمد،ص۔۲۹۵

الصنادید اور غالب کے خطوط کے بیانات کے علاوہ چند اشعار درج کیے گئے ہیں۔ان اقتباسات اور اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ مصنفین اس امر پر متفق ہیں کہ دہلی کے اردو بازار کی بنا پراس زبان کا نام زبان اردو قرار پایا۔ساتھ ہی یہ زبان مختلف عہد اور علاقوں میں مختلف ناموں مثلاً دہلوی، دکنی، گجری ،ہندوی، ہندوستانی اور ریختہ سے موسوم کی گئی اس کا مفصل ذکر کیا گیا ہے۔دوسرا باب اردو زبان کے آغاز ابتدا سے متعلق پیش روؤں کے مختلف نظریات پر مبنی ہے اوراس کے ساتھ اردو ساز تاریخ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جدید ہند آریائی زبانیں نئی طرح سے ارتقا کی راہ پر گامزن ہوئیں۔یہ باب تفصیلی گفتگو کا متقاضی ہے۔آئندہ سطور میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔حالاں کہ شروع کے دو ابواب بطور تمہید لکھے گئے ہیں لیکن اس سے ملحق تیسرا، چوتھا اور پانچواں باب کتاب کی اصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس میں پنجاب کا علاقہ اور اس کی انفرادیت، پنجابی اور اردو، قدیم اردو پر پنجابی زبان کے اثرات، پنجاب کی مختلف زبانوں کے علاوہ پنجابی زبان کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے۔پنجابی زبان کے ساتھ دہلی اور نواح دہلی کی دوسری زبانوں بالخصوص برج بھاشا اوراس کی خصوصیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔کتاب کے نصف سے زیادہ صفحات میں ہندوستانی زبانوں کے اس عہد کے تقریباً تمام مشاہیر پنجاب اور ملک کے دیگر حصوں کے نامور مصنفین کے کارنامے اوراردو زبان کی ترویج واشاعت میں ان کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔بحیثیت مجموعی کتاب کی روح تین اہم باتوں میں سمٹ آئی ہے۔اول ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کو بنیاد بنا کر ایک مفروضہ قائم کیا گیا ہے جس میں مصنف خود قیاس آرائی سے کام لیتے ہیں جو حقیقی معنوں میں ایک بحث کا موضوع ہے۔دوم زبانوں کا غائر مطالعہ کیا گیا ہے اوران میں لسانی بنیادوں پر مماثلتیں تلاش کی گئی ہیں اس طریقۂ کار سے بیشتر مثبت ذخیرہ ہاتھ آیا ہے۔تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ شیرانی ایک بہت ہی محتاط محقق تھے اس کام کی دھن میں انہوں نے یا تو بہت ایسی گم نام شخصیتوں کے متعلق معتبر معلومات فراہم کردی ہیں۔یا پھر ہم جن سے واقف تھے ان سے متعلق معلومات میں مزید اضافہ کیا ہے۔

مذکورہ تصنیف کا بالاستعیاب مطالعہ کرنے اوراس تحریر میں تہ نشیں واقعے کی تفہیم کے بعد ہم جس

نتیجے پر پہنچتے ہیں انہیں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کی ابتدا عرض حال اور مقدّمہ سے ہوتی ہے جس میں پہلے ہی یہ واقعہ درج ہے کہ مصنف سے پرنسپل عبداللہ یوسف علی نے اردو زبان کے آغاز اور قدامت کے موضوع پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ شیرانی صاحب کا تحقیقی ذہن فوراً پیچھے کی جانب رجوع کرتا ہے اور تا دم تالیف اردو سے متعلق تمام تحریروں اور نظریات کا منظرنامہ ان کی نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ اس تمام پس منظر سے موصوف اپنے کام کی تین باتیں چن لیتے ہیں اور اپنے موضوع کا خاکہ تیّار کر لیتے ہیں۔

(۱) اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ''پنجاب میں اردو'' کی تصنیف سے قبل اردو زبان سے متعلق جتنی بھی تحریریں یا تصانیف ملتی ہیں ان میں تقریباً سبھی میں اردو کے مولد کی حیثیت سے دہلی اور نواح دہلی کے علاقے کی نشاندہی کی گئی ہے۔

(۲) ان میں تقریباً سب میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اردو زبان کی ابتدا اور اس کی نشوونما ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ان کی زبانوں اور یہاں کی علاقائی بولیوں کے اشتراک سے ہوئی ہے۔

(۳) تیسری اور اہم بات یہ ہے کہ چند ایسی تحریریں منظر عام پر آ چکی تھیں جن میں پنجاب میں اردو کی ابتدا سے متعلق اظہار خیال کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک کے متعلق شیرانی خود اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' کے عرض حال میں یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''اردو زبان کے آغاز کا سرزمین پنجاب سے منسوب ہونا کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے۔ اس سے پیشتر پنڈت کیفی اور شیر علی خاں صاحب سرخوش اپنے پرلطف تذکرۂ ''اعجاز سخن'' میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں مگر اس کتاب میں، اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔'' اس کے علاوہ مسعود حسین خاں نے بھی اپنی تصنیف ''مقدّمہ تاریخ زبان اردو'' کے پیش لفظ میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ''شیرانی کو اپنے نقطۂ نظر کے لیے اشارہ خود گریرسن کی کی تحریروں میں مل گیا ہے جس نے اردو کے ''پنجابی پن'' پر غیر معمولی زور دیا ہے۔''

شیرانی ایک ماہر محقق اور کثیر المطالعہ انسان تھے ''پنجاب میں اردو'' کی تصنیف سے قبل اردو زبان سے متعلق تمام تحریریں ان کے پیشِ نگاہ تھیں۔ اس موضوع کے انتخاب کے بعد ان کا ذہن کچھ نئی باتوں کی

جانب منتقل ہوا ہوگا۔اس امر کی مزید وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ تصنیف کا موضوع ''اردو کی قدامت'' اور اردو کی ابتدا سے متعلق ذہن کا ارتکاز مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کا واقعہ اور پس منظر میں چند ایسی تحریریں موجود تھیں جن میں اردو کے مولد کے حیثیت سے سرزمین پنجاب کی نشان دہی کی گئی تھی۔موضوع واضح ہو اور مصنف باصلاحیت ہو تو مفروضہ کو بھی دلیلوں اور روایتوں کے ذریعے سے مستحکم بنیاد فراہم کرسکتا ہے جیسا کہ اس تصنیف میں مصنف نے کیا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طویل تاریخ کی روشنی میں اس تصنیف میں لسانی دلیلوں کے ساتھ پنجابی کے اثرات اردو زبان پر دکھائے گئے ہیں اور یہی مصنف کا کارنامہ ہے۔لیکن اس سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ دو ہم سایہ بولیوں میں کچھ نہ کچھ مشترک خصوصیات ضرور ہوتی ہیں۔عین ممکن ہے کہ یہ واقعہ اس کے برعکس بھی ہو اور اردو زبان کے اثرات پنجابی زبان پر بھی مرتب ہوئے ہوں۔حقیقت یہ ہے کہ ہماری زبان کے ماہرین شیرانی کے اخذ کردہ نتائج کو زاویہ بدل کر بھی دیکھتے ہیں۔

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں یہ عرض کیا گیا کہ مقدمہ پوری تصنیف کا آئینہ ہے اس میں مصنف نے اپنا منشا اور موقف تقریباً واضح کر دیا ہے۔مقدّمہ اور مکمل کتاب میں موضوع کے جواز میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں تسلسل کے ساتھ ان کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے تا کہ اس کا واضح خاکہ ذہن نشین رہے۔

کتاب کا موضوع اردو زبان کی قدامت ہے اس تعلق سے محمود شیرانی کا خیال ہے کہ:

> ''ہم اردو کے آغاز کو شاہجہاں یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں۔لیکن یہ زبان اس زمانہ سے بہت زیادہ قدیم ہے بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود انہیں ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔'' [۱۵]

اس سلسلے میں ان کا ایک اور بیان قابل ذکر ہے کہ:

> ''اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہوگئی ہے جس

---

[۱۵] پنجاب میں اردو : محمود شیرانی،ص۔الف(مقدمہ)

دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر توطن اختیار کر لیا ہے۔''[۱۶]

سلسلۂ گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے کتاب کے مقدمہ میں اردو زبان اور برج بھاشا کے تعلق کو یکسر مسترد کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں ہے ان دو زبانوں میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے۔ کتاب کے دوسرے باب میں جہاں اردو زبان کے آغاز کے حوالے سے قدما کی آرا نقل کرتے ہیں اور بالخصوص محمد حسین آزاد کا خیال کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے اور ان کے ہم زبان سید شمس اللہ قادری کے خیال کی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جب ہم اردو کے ڈول اس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے اور برج بھاشا کا رنگ اور ہے دونوں کے قواعد اور ضوابط و اصول مختلف ہیں۔ اردو برج بھاشا کے مقابلہ میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت رکھتی ہے۔''[۱۷]

اردو کے تعلق سے برج بھاشا کی تردید کی گئی ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ یہاں سے مصنف نے گریز اختیار کیا ہے اور اردو میں پنجابی اور ملتانی کا عکس دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موصوف اپنا نظریہ اس کتاب کے دوسرے، تیسرے، چوتھے اور پانچویں باب میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس تفصیل پر روشنی ڈالنے سے قبل مناسب ہوگا کہ اس کی اجمال جو مقدمہ میں پیش کی گئی ہے اس پر ایک نگاہ ڈالی جائے۔ اس گفتگو میں کمال دلچسپی کا پہلو شامل ہے جسے واضح کرنے کے لیے یہاں چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ''جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی ہے بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ (۲)......گریرسن نے تو صاف دہلی کو ہریانوی زبان کے

---

[۱۶] پنجاب میں اردو : محمود شیرانی، ص۔۲۶

[۱۷] پنجاب میں اردو : محمود شیرانی، ص۔۲۷، ۲۸

علاقہ میں شامل کر دیا ہے مگر راقم کی رائے میں ہریانوی کوئی علاحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہے یعنی وہی اردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے اگر ہم اس کو اردو نہ مانیں تو اردو کی شاخ ماننے میں تو ہمیں عذر نہیں ہونا چاہیے۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے۔

(۳) اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے وقت کون سی زبان بولی جاتی تھی۔ یا وہ راجستھانی ہوگی یا برج! اس میں شک نہیں کہ آج دہلی، میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ دوآبہ میں اردو بولی جاتی ہے۔ لیکن اب سے تین صدی پیشتر، اس علاقہ کی یہ زبان نہ تھی، بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا۔ اردو نے ان علاقوں سے رفتہ رفتہ برج کو خارج کر دیا ہے!

(۴) اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے۔ اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے![18]

مذکورہ بالا اقتباسات اگر چہ تضاد سے پر ہیں لیکن ان کی روشنی میں مصنف کا خیال سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ موصوف یہ اعتراف کرتے ہیں کہ سیاسی واقعات اور حالات جو اس عقیدہ کو تسلیم کرنے پر انہیں مجبور کرتے اس کے سوا ان کے پاس اس نظریہ کے ثبوت میں کوئی قدیم شہادت یا سند موجود نہیں ہے۔

---

[18] مقدمہ پنجاب میں اردو : محمود شیرانی، ص۔د

ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ جو مصنف کی اس تصنیف کی بنیاد ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ محمد بن قاسم کی قیادت میں عرب مسلمان ۷۱۲ء میں سندھ اور ملتان فتح کرتے ہیں۔ اس کے بعد سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۰۰ء سے ۱۰۲۶ء تک ہندوستان کے مختلف مقامات پر سترہ بار حملے کئے اور اس درمیان ۴۱۳ ہجری یعنی ۱۰۰۴ء میں ملتان اور لاہور یعنی پنجاب پر قبضہ کر کے اس کو سلطنت غزنہ کی قلمرو میں شامل کر لیا۔ یہ مفتوحہ علاقہ سندھ سے جالندھر تک پھیلا ہوا تھا اور لاہور کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس طرح تقریباً پونے دوسو برس تک یہاں مسلمان حاکم رہے اور ان کی ایک کثیر تعداد محمود غزنوی کے وقت پنجاب میں آباد ہوگئی۔ مسلمانوں کی یہ کثیر تعداد فوجی، سرکاری اور تجارت کی غرض سے اس عہد میں پنجاب میں آباد تھی اور پنجاب ہی کو اپنا وطن تصوّر کرنے لگی تھی۔ لاہور اس عہد کے مسلم ہندوستان کا مرکز بن گیا تھا۔ لاہور کی اسی پنجابی، ترکی اور فارسی کی ادبی فضا میں مسعود سعد سلمان کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو نما اور تعلیم و تربیت پائی۔ مسعود سعد سلمان ترکی اور فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے اس کے علاوہ ہندی کے صاحب دیوان شاعر ہونے کی شہادت حضرت امیر خسرو نے ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں دی ہے۔ اس کے علاوہ محمود شیرانی نے جن شعرا، علما اور بزرگوں کے حالات زندگی اور ادبی خدمات درج کئے ہیں ان کے نام ہیں مسعود رازی، ابوالفرج رونی، شیخ اسمٰعیل لاہوری، ابی الحسن بن ابو عثمان جن کی مشہور تصنیف کشف المحجوب ہے۔ یہ صوفی بزرگ لاہور میں مدفون ہیں جمہور انہیں داتا گنج بخش کے نام سے جانتی ہے۔ ان ناموں کے علاوہ اور کئی علما کا ذکر موجود ہے۔ اس طرح مصنف یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ لاہور ان ایام میں ایک بارونق اسلامی شہر تھا اور مرجع علم و فضل و ادب بن گیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کا یہ بیان قابل ذکر ہے کہ:

> ''آل غزنہ کی حکومت ہندوستان میں کم وبیش ایک سو ستّر سال تک رہی ہے اس عرصہ میں مسلمان اور ہندو اقوام کی یکجائی سے ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا لازمی بات ہے۔ سرکاری ضروریات کی بنا پر بھی شاہی عہدہ داروں اور ملازمین کے لیے اس ملک کی زبان سے واقف ہونا ضروری

تھا۔ آخر غزنویوں کے قبضہ میں تمام پنجاب، سندھ اور ملتان تھا بلکہ دہلی
کے قریب تک پھیلے ہوئے تھے۔ چوں کہ لاہور ہند کا دارالسلطنت تھا اس
لیے ظاہر ہے کہ اس خطہ کی زبان کو اس عہد کی حکومت اور مسلمانوں نے
ترجیح دی ہوگی۔ یہ خیال کرنا کہ جب تک مسلمان پنجاب میں آباد رہے
انھوں نے کسی ہندی زبان سے سروکار نہ رکھا اور جب پنجاب سے دہلی
گئے تب برج بھاشا اختیار کی ایک ناقابل قبول خیال ہے جو عقل و روایت
کے منافی ہے۔[19]

مذکورہ بیانات اور گفتگو کی روشنی میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اردو کی ابتدا کے لیے تاریخ کی مدد سے مصنف نے کس طرح بنیاد حاصل کی ہے۔ باتیں اسی بیان پر ختم نہیں ہوتیں بلکہ اس مفروضہ اور تاریخ کے ڈانڈے دہلی تک ملانا باقی ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ ایک بار پھر کروٹ لیتی ہے ۱۱۹۲ء میں فتح دہلی کا واقعہ رونما ہوتا ہے۔ اس واقعہ کی تاریخی حقیقت یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ بارہویں صدی کے وسط میں افغانستان کے شمال مغربی علاقہ میں غور خاندان ایک طاقت کی حیثیت سے ابھرنے لگا۔ ابتدائی دنوں میں غوری غزنویوں کے ماتحت تھے لیکن جلد ہی یہ بوجھ انھوں نے اپنے سر سے اتار پھینکا۔ غزنی کو اپنا مرکز بنا کر سلطان معزالدین محمد بن سام یعنی شہاب الدین محمد غوری نے ۱۱۷۵ء میں پہلے ملتان پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد ۱۲۰۵ء تک اپنی سلطنت کی توسیع اور مفتوحہ علاقوں کی بقا کے لیے ہندوستان پر متواتر کئی حملے کئے اور اس طرح دہلی سلطنت تک کی راہیں ہموار کرلیں۔ ۱۱۹۱ء میں ترائین کی ایک جنگ ہار کر دوسری مرتبہ ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج چوہان کو شکست دی اور اس طرح اجمیر اور دہلی کے علاوہ ہندوستان کے مختلف ریاستوں کو اپنے اپنے اقتدار میں شامل کرلیا۔

شیرانی کے مطابق سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری نے اپنے اپنے عہد میں لاہور اور ملتان کے بعد دہلی کی جانب جب جب پیش قدمی کی تو لاکھوں انسان پنجاب کی جانب سے ہجرت کر کے

---

[19] پنجاب میں اردو : محمود شیرانی، ص۔۳۴، ۳۵

دہلی اوراس کے نواح میں آباد ہو گئے۔ بالخصوص شہاب الدین غوری کے عہد میں اجمیر، ہانسی، میرٹھ، دہلی، بدایوں، قنوج، بنارس، گوالیر، کالنجر اور مالوہ سب کے سب اس کے زیر اقتدار تھے تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نئے علاقہ کے انتظام کے لیے کس قدر آدمی درکار ہوں گے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں ہر شہر میں انہیں اپنی چھاؤنی رکھنی پڑی ہوگی۔ چاروں طرف طاقتور ہندو راجہ موجود تھے جن کو قدرتاً مسلمانوں سے عداوت تھی۔ اس لیے ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس ایّام میں شمال سے بڑی تعداد میں لوگ ہجرت کر گئے۔

ایسی سیاسی صورت حال کے پیش نظر پروفیسر شیرانی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے جسے گذشتہ صفحات میں اقتباس کی شکل میں پیش کیا گیا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے اگر کوئی زبان نہیں بنی تھی تو غزنوی دور میں جو ایک سو ستّر سال پر محیط ہے اس میں کوئی مخلوط زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔ مزید ان کا یہ خیال ہے کہ چوں کہ یہ زبان پنجاب میں بنی ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی سے مماثل ہو یا اس کی قریبی رشتہ دار۔ اس طویل گفتگو کا ان کے الفاظ میں ماحاصل یہ ہے کہ:

> ''یہ امر اظہر من الشّمس ہے کہ سیاسی واقعات کا اثر زبان پر بہت گہرا ہوتا ہے چنانچہ جب ہم اردو اور پنجابی زبانوں کی صرف ونحو کے قواعد اور عام ہیئت کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ اثر قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے اور دونوں زبانوں کی مماثلت کا راز صریح طور پر آشکار ہو جاتا ہے۔'' [۲۰]

اس طرح تاریخ کی روشنی میں اردو زبان کی ابتدا کے اس دعویٰ کو تقویت بخشنے کے لیے دلیلیں درکار تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے مقدمہ میں ہی ارشاد فرمایا ہے کہ ''اس کے متعلق شہادت لسانی کافی ہے۔'' ہم دیکھتے ہیں کہ شیرانی نے اس نوعیت کی بہت ساری شہادتیں جمع کر دی ہیں اور انہیں پیش کرنے کے لیے دو ابواب مختص کیے ہیں۔ ان لسانی مثالوں کی رو سے وہ بتاتے ہیں کہ اردو اپنی صرف ونحو میں ملتانی زبان سے بہت قریب نظر آتی ہے۔ دونوں زبانوں میں اسما اور افعال کا خاتمہ الف پر ہوتا ہے۔ دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد اور افعال مرکبہ میں متحد ہیں۔

---

[۲۰] پنجاب میں اردو : محمود شیرانی، ص۔۴۹

اور اس کے علاوہ پنجابی اور اردو میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں ۔ ان دونوں زبانوں کا اشتراک اور قدیم اردو پر پنجابی زبان کے اثرات کی نشاندہی کے لیے الگ سے ایک باب قائم کیا ہے۔ اور کتاب کے تقریباً آدھے سے زیادہ صفحات میں مصنفین اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح کل ملا کر بہت ہی ہوشیاری سے موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے اور بڑے مدلل انداز میں اس کی وکالت کی گئی ہے۔

پنجاب میں اردو جب منظر عام پر آئی تو علمی حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی ۔ حافظ محمود شیرانی سے پہلے کسی نے اتنی محنت اور عرق ریزی سے اس موضوع پر اتنی تفصیل سے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد لوگوں نے اس نظریہ کی پر زور حمایت اور تائید کی بعض نے اس نظریہ سے اختلاف بھی کیا۔ اس سلسلے میں محی الدین قادری زورؔ، مسعود حسین خاں، سیّد احتشام حسین، شوکت سبزواری، سہیل بخاری اور گیان چند جین کے نام قابل ذکر ہیں ۔ محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب میں دبی زبان میں اس خیال کی تائید کی ہے کیوں کہ اس سے اردو کی ابتدا سے متعلق زور کے خیال کو تقویت ملتی ہے۔ آیندہ صفحات میں ''ہندوستانی لسانیات'' پر گفتگو کے حوالے سے ہم دیکھیں گے کہ ڈاکٹر زورؔ کا نے پنجاب تا الہ آباد کی زبان پر غیر معمولی توجہ صرف کیا ہے ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث تصنیف پر ماہرین کی آرا کے حوالے سے مجموعی طور پہ گفتگو کی جائے ۔ اس بات پر تقریباً ماہرین متفق ہیں کہ دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے بعد اردو زبان کی نشو ابتدا ہوتی ہے۔ شیرانی نے اس حقیقت کے دو ٹکڑے کر دیے پہلا تاریخ اور جائے واقعہ ڈھکیل کر پیچھے لے گئے اور دوسرا حصہ مذکورہ زبان کے وجود کے لیے مسلمانوں کی آمد اور ان کا اشتراک کا واقعہ برقرار رکھا۔ اس درمیان مقصد اور حقیقت کی کشمکش میں مبتلا ہو کر ہریانوی کو اردو کی قدیم شکل یا اس کی شاخ کہہ کر دامن جھاڑ لیا ہے۔

مسعود حسین خاں نے اپنی تصنیف میں شیرانی کے نظریہ کی تاریخی اور لسانی دونوں اعتبار سے تنقید کی ہے۔ وہ اردو کے ارتقا اور ابتدا کی اصل تاریخ شہاب الدین غوری کے فتح دہلی کے بعد شروع کرتے ہیں ۔[۲۱]

---

[۲۱] مقدمہ تاریخ زبان اردو : مسعود حسین خاں، ص۔۷۸

گریرسن نے ہندوستانی زبانوں کی گروہ بندی میں راجستھانی اور گجراتی کی طرح پنجابی کو اس کی بیرونی شاخ میں جگہ دی ہے۔ مسعود حسین خاں نے اس درجہ بندی سے اتفاق کرتے ہوئے شورسینی اپ بھرنش یعنی مدھیہ کی زبان کی مختلف بولیوں کے پنجابی زبان پر اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کی جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کی عہد قدیم سے نشاندہی اور اپ بھرنش کے ادبیات کا لسانی جائزہ ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی تمام ہم سایہ بولیوں کا تقابلی مطالعہ بھی ضروری ہے ان باتوں کا لحاظ نہ رکھ کر شیرانی نے یک طرفہ نتائج اخذ کیے ہیں اور اپنے نظریہ کو بے بنیاد بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں مسعود حسین خاں اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے اردو اگر ایک جانب قواعد کی رو سے پنجابی سے ملتی ہے تو دوسری طرف ہریانوی سے بھی مماثلت رکھتی ہے۔ اس روشنی میں وہ شیرانی کے تمام لسانی نتائج کا تجزیہ کرتے ہیں جس کی ایک مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ فعل امر کے متعلق شیرانی کا ماننا ہے کہ امر کا قاعدہ اردو پنجابی میں بالکل ایک ہے یعنی علامت مصدر گرادی جائے تو امر باقی رہ جاتا ہے مثلاً چلنا (چل) کرنا (کر) وغیرہ۔ مسعود حسین خاں کے مطابق دراصل یہ قاعدہ پنجابی اور اردو کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی تمام جدید ہند آریائی زبانوں مثلاً بنگالی، مراٹھی، گجراتی میں بالکل یکساں ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ موصوف نے یک طرفہ نتائج برآمد کیے ہیں۔ شیرانی کے تاریخی جواز سے متعلق مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ:

> ''محمود شیرانی اور ڈاکٹر زورؔ دونوں ہی اپنی تحریروں میں یہ بات ثابت کرنے سے قاصر ہیں کے پنجاب سے کبھی اتنے وسیع پیمانے پر ہجرت ہوئی ہے جس کی مثال موجودہ شہر دہلی ہے۔ آج بھی کئی لاکھ کی آبادی کے ردوبدل کے باوجود شہر دہلی کے آس پاس کے اضلاع کی بولیوں کا اقتدار قائم ہے۔''[۲۲]

مسعود حسین خاں کی مذکورہ کتاب کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں ہی احتشام حسین کی ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' منظر عام پر آئی۔ دراصل یہ جان بیمز کی کتاب کا ترجمہ ہے اور اس میں دیباچہ کے طور پر ان کا

---

[۲۲] مقدمہ تاریخ زبان اردو : مسعود حسین خاں، ص۔۲۳۳

ایک مبسوط مقدمہ شامل ہے۔اس میں شمالی ہند اور مغربی یو پی کی بولیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے شیرانی کے خیال سے اختلاف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

''پروفیسر محمود شیرانی نے اس بات پر بہت زیادہ زور دیا ہے کہ اردو کی ابتدائی ساخت پنجابی سے تسلیم کر لی جائے لیکن دشواری یہ ہے کہ اول تو پنجابی کے تشکیل پانے کا وہی زمانہ ہے، دوسرے یہ کہ دہلی میں خود لاہوری سے مختلف ایک بول چال کی زبان تھی جسے امیر خسرؔو نے دہلوی کہا ہے۔اس لیے اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دہلی کی نواح کی بولیوں میں جس نئی بولی کا نشوونما ہوا وہ اپنی الگ حیثیت رکھتی تھی اور پنجابی سے بہت سی مماثلتیں رکھنے کے باوجود محض اس کا تسلسل یا روپ یا نتیجہ نہیں تھی اور نہ اس کی ابتدا غلاموں کے عہد میں پنجابی مسلمانوں کے دہلی آنے کے بعد ہوئی۔''[۲۳]

شوکت سبزواری نے اپنی کتاب ''داستان زبان اردو'' میں اردو کے مختلف نظریوں کے حوالے سے برج اور پنجابی زبانوں کی مشابہتوں اور ان کی لسانی خصوصیات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ پنجابی زبان کی صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات کا موازنہ کر کے دونوں زبانوں کے بنیادی اختلافات واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ان لسانی تفصیلات کے ذکر کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔انہوں نے موازنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''اردو اور پنجابی اپنی تمام لسانی مشابہتوں کے باوجود......ساخت کے اعتبار سے مختلف زبانیں ہیں۔ان میں اصلی اور نسلی امتیازات ہیں جو ان

---

۲۴؎ داستان زبان اردو : ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص ۸۷

۲۳؎ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ : سیّد احتشام حسین، ص۔۵۷

۲۴؎ داستان زبان اردو ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۔۸۷

کے مختلف الاصل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور صاف صاف چغلی کھاتے

ہیں کہ ایک گھرانے کی نہیں دو نسل کی ہیں۔''[۲۴]

گریرسن اور ہیورنلے کی گروہ بندی کی بنیاد پر موصوف اساسی طور سے پنجابی اور اردو کو مختلف زبانیں مانتے ہیں۔ وہ اپنے خیال کی وضاحت تین باتوں کی روشنی میں کرتے ہیں۔

(۱) اردو اصل اور نسل کے لحاظ سے پنجابی سے مختلف ہے۔

(۲) اردو کا اختلافی سرمایہ پنجابی کے سرمایہ سے زیادہ قدیم ہے۔

(۳) اردو اور پنجابی کا مشترک سرمایہ ان زبانوں کو اپنی اپنی اصل سے ترکے میں ملا، یا پنجابی نے قدیم ہندوستانی سے مستعار لیا ہے۔

مزید یہ کہ جو باتیں اردو زبان سے مختص ہیں اگر وہ پاس پڑوس کی زبانوں میں نظر آئیں تو وہ اردو کی سگی بہن ہوگی اور اگر بہن نہیں ہوگی تو وہ خصوصیات اس نے اردو سے اختیار کی ہوگی۔ مسعود حسین خاں اور شوکت سبزواری کے تجزیے اور ان سے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں بحیثیت مجموعی محمود شیرانی کے نظریہ کی مختلف جہتوں سے وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہاں اب اس سے زیادہ گفتگو کو طول دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ایک طرف پنجاب میں شیرانی اور دوسری جانب حیدرآباد دکن میں سیّد محی الدین قادری زورؔ دونوں ہی کو اس موضوع سے غایت درجہ کا لگاؤ تھا۔ آئندہ صفحات میں ان کے نظریہ اور تصنیف پر تفصیلی گفتگو پیش کی جاتی ہے۔

# ہندوستانی لسانیات : ۱۹۳۲ء

سیّد محی الدین قادری زورنے اردو زبان و ادب کے ذخیرہ میں وقیع اضافہ کیا ہے۔مختلف موضوعات مثلاً لسانیات، تاریخ، تنقید، شاعری، افسانے اور تبصرے وغیرہ پر ان کی تقریباً اکیس کتابیں موجود ہیں۔وہ ۱۹۰۴ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ابتدائی مکتبی تعلیم کے بعد عربی اور فارسی کی مزید تعلیم کے لیے مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد میں داخل ہوئے اس کے بعد سیٹی ہائی اسکول حیدرآباد سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔عثمانیہ یونیورسٹی سے ایف۔اے، بی۔اے اور ۱۹۲۷ء میں ایم۔اے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔اس لیے ریاست حیدرآباد نے ان کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے وظیفہ مقرر کیا جس سے وہ انگلستان چلے گئے اور لندن یونیورسٹی سے ''آریائی زبانوں کی لسانی تحقیقات'' پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔وہاں سے پیرس کا سفر کیا جہاں ''سوربون یونیورسٹی'' کے ''ادارۂ صوتیات'' میں انہیں فرانسیسی ماہرین سے اس موضوع پر استفادہ کا بھرپور موقع ملا اور تجرباتی صوتیات سے واقفیت حاصل کی۔وہاں قیام کے دوران انہوں نے جو علمی تحقیقات کی اسے کتابی صورت میں ''ہندوستانی فونے ٹکس'' کے نام سے ۱۹۳۰ء میں پیرس سے انگریزی زبان میں شائع کیا۔بعد میں اس عملی کام کو مزید وضاحت اور صراحت کے ساتھ اردو زبان میں ''ہندوستانی لسانیات'' کے نام سے ۱۹۳۲ء حیدرآباد سے شایع کیا۔

۱۹۳۱ء میں وہ یورپ سے واپس آئے اور اسی سال عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔۱۹۳۱ء میں ہی حیدرآباد میں ''ادارۂ ادبیات'' کی بنیاد ڈالی اور ''ایوان اردو'' کے نام سے بعد میں ایک ریسرچ سنٹر بھی قائم کیا۔عثمانیہ یونیورسٹی میں ترقی کر کے وہ پروفیسر مقرر ہوئے اس کے علاوہ ''دارالعلوم کالج'' کے پرنسپل بھی رہے۔جون ۱۹۶۱ء میں وہ کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں اردو فارسی کے پوسٹ گریجویٹ شعبے کے صدر ہوئے لیکن کچھ ہی دن بعد ۲۵ ستمبر ۱۹۶۲ء کی شب حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے سری نگر میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

سیّد محی الدین قادری زورؔ پہلے ماہر ہیں جنہوں نے یورپ میں لسانیات کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ۔لندن اور پیرس میں قیام کے دوران مغربی ماہرین سے استفادہ کیا جس کا اعتراف موصوف نے اپنی تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' کی تمہید میں کیا ہے۔ جدید ترین تحقیقات اور لسانیات کی روشنی میں اردو زبان کے موضوع پر سوا ''پنجاب میں اردو'' کے کوئی وقیع کام نظر نہیں آتا ہے۔لیکن ٹھیک چار سال بعد انگلستان سے واپس آ کر سیّد محی الدین قادری زور نے ''ہندوستانی لسانیات'' کی ۱۹۳۲ء میں اشاعت کی۔ یہ بات مندرجہ بالا سطور میں بیان کی جا چکی ہے کہ یہ تصنیف موصوف کی تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ یہاں مزید وضاحت کی ضرورت نہیں کے اپنی نوعیت کی یہ پہلی تصنیف تھی جس میں باقاعدہ لسانیات اور اس کے لوازم کو برتا گیا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ محمود شیرانی نے اپنی مذکورہ تصنیف میں پنجاب کو اردو زبان کا مولد قرار دیا ہے۔محمود شیرانی کے بعد ڈاکٹر زور نے بھی کچھ اسی طرح کا خیال ظاہر کیا ہے اور پنجاب تا الہ آباد کی زبان پر اردو زبان کی بنا رکھی ہے۔ڈاکٹر زورؔ نے ایک مضمون میں شیرانی کے نظریہ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یہ عجیب بات ہے کہ اردو اور پنجابی کے اصل تعلق کی نسبت کسی یوروپی ماہر لسانیات کا ذہن اب تک منتقل نہیں ہوا۔اس کی طرف سب سے پہلے ہندوستانیوں ہی کی توجہ منعطف ہوئی اور ہندوستانی اہل قلم ہی نے اردو اور پنجابی کے اس بنیادی تعلق کو سب سے پہلے بے نقاب کیا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں پروفیسر حافظ شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں اس خیال کو نہایت واضح انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی راقم الحروف اردو کے آغاز و ارتقا کے موضوع پر لندن یونیورسٹی میں لسانی تحقیقات میں مصروف تھا۔ میرے مطالعے اور تلاش و جستجو میں بھی یہی حقیقت بے نقاب ہوئی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے یہ واضح ہے کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب

میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبۂ گنگ وجمن کی زبان میں بہت کم فرق

پایا جاتا تھا۔'' ۲۵

نظریہ کی رو سے دونوں حضرات تقریباً ہم خیال ہیں لیکن پیش کش کا انداز مختلف ہے۔ڈاکٹر زوردر اصل لسانیات کے پیچ وخم سے واقف تھے اس لیے ان کی تصنیف کا مقصد ہی یہ تھا کہ اہل اردو کو اردو زبان کی حقیقت اور جدید اصول لسانیات سے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچائیں ۔ان کی تصنیف '' ہندوستانی لسانیات'' کا مجموعی خاکہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے مصنف نے کتاب کو دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔اس کا پہلا حصہ عام لسانیات (General Linguistics) سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ ہندوستانی زبان اور اس کے مسائل سے مخصوص ہے۔عام لسانیات میں،لسانیات کے مقاصد اور اس کی اہمیت کے علاوہ اس کے دائرۂ کار سے بحث کی گئی ہے۔لسانیات کا دائرۂ کار یہ ہے کہ اس میں کسی زبان کا جاننا اور سیکھنا مقصد نہیں ہوتا بلکہ زبان اور زبان سے متعلق معلومات حاصل کرنے سے سروکار ہوتا ہے۔مثلاً زبان کیا ہے؟ زبان کی اہمیت اور اس کی افادیت کیا ہے؟ کسی زبان کی اصل اس کی ابتدا ارتقا اور اس کی تاریخ کیا ہے۔اس کے تحت ہندوستانی یعنی بحیثیت مجموعی ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں کے ماخذ کی تلاش میں ہند آریائی پھر ہند یوروپی خاندان کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اس مقالہ کے پہلے اور دوسرے باب میں اس ضمن میں تفصیلی گفتگو پیش کی گئی ہے اور زیر نظر کتاب سے بھر پور استفادہ بھی کیا گیا ہے ساتھ ہی بہ اعتبار ضرورت اس سے اقتباسات بھی نقل کئے گئے ہیں۔اس تصنیف کا دوسرا حصہ ہندوستانی زبان بالخصوص اردو اور اس سے متعلقہ مسائل پر مبنی ہے۔اس حصہ میں ہندوستانی زبان کے آغاز اور ابتدا سے متعلق جتنے نظریے ہیں اور ان سے متعلق قدیم اور جدید مواد موجود ہیں ان سب کا ذکر کرتے ہوئے جدید تحقیقات کی رو سے اردو زبان کے آغاز اور ابتدا کی تاریخ متعین کی گئی ہے۔جدید تحقیقات کی روشنی میں اردو زبان سے متعلق جو بیانات درج کیے گئے ہیں کتاب کا وہی حصہ دراصل مصنف کی مسلسل تلاش وجستجو اور علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

---

۲۵ اردو زبان کی تاریخ : مرزا خلیل احمد بیگ،ص۔۱۸

اردو زبان کی تاریخ پر گفتگو جب بھی شروع ہوگی چاہے وہ جتنی بھی سائنٹفک ہو اس کے پس منظر میں قدما کی مختلف تحریروں کا ذکر ضرور ہوگا۔ ڈاکٹر زور کی نگاہ ان تمام تحریروں پر ہے جن میں ایک قدر مشترک ہے کہ ان میں اردو زبان کے آغاز کو ہندو مسلم میل جول کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس میل جول کے مقام کا تعیّن، نوعیت اور پھر نتیجے نکالنے میں یہ سب تحریریں ایک دوسرے سے مختلف ہوگئی ہیں اس لیے نظریات بھی مختلف ہیں۔ موصوف بطور خاص صرف تین نظریات دکن میں اردو، سندھ میں اردو اور پنجاب میں اردو کا ذکر کرتے ہیں۔ مولانا شیرانی کے نظریہ اور دلائل کو سنجیدگی سے موضع بحث بناتے ہیں۔ اس سے متعلق ان کا خیال ہے کہ ''پروفیسر شیرانی نے جو مواد پیش کیا ہے وہ نہایت مفید اور اردو کی تخلیق اور آغاز سے متعلق مفید نتیجوں پر پہنچنے کے لیے کافی مدد و معاون ہوسکتا ہے۔''[۲۶] ان نظریات کی توضیح کے بعد وہ اپنی تحقیقات کا خلاصہ بیان کرتے ہیں اور اس کے جواز میں چند تاریخی اور لسانی دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ یوں تو گذشتہ صفحات میں ڈاکٹر زورؔ کے اردو زبان سے متعلق خیالات کے اشارے ان کی تحریروں کے حوالے سے پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ اب یہاں ان کا نظریہ وضاحت کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت نہ بنالیا۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم ''نئے ہند آریائی دور'' میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ مگر اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبۂ گنگ و جمن میں بولی جاتی تھی........

---

۲۶؎ ہندوستانی لسانیات : محی الدین قادری زورؔ، ص۔ ۹۶

اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو
ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں
پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے۔ لیکن مسلمانوں کے صدر
مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں اس لیے اردو زیادہ کھڑی بولی
ہی سے متاثر ہوتی گئی۔'' [۲۷]

سیّد محی الدین قادری زور کے خیالات اتنے واضح ہیں کے مزید ان کی وضاحت ممکن نہیں اور نہ ان کے الفاظ کسی نوع کا ابہام ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں ایک بات کی گنجائش ضرور ہے کہ ان کے اس نظریہ کی بنیاد سے متعلق چند باتیں عرض کی جائیں۔ وہ تاریخی واقعات سیاق وسباق ہے کہ جب شمال کے مسلمان حکمراں مثلاً علاؤالدین خلجی، اور اس کے بعد اس کا سپہ سالار ملک کافور اور پھر محمد بن تغلق نے دکن پر حملے کیے تو ان کی فوج کے ساتھ شمالی ہند کی زیر تکمیل زبان بھی وہاں پہنچی۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اس زمانے میں دکن میں اس مقابلے کی کوئی زبان نہیں تھی بلکہ اسی ناپختہ زبان میں ہی ادب تخلیق ہوتا رہا اور پورے دکن میں یہ زبان پھیل گئی۔ اس کے بعد سیاسی حالات کی بنا پر دکن اور شمال کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ جو زبان شمال سے دکن پہنچی تھی وہ اسی حالت میں ادب کی شکل میں محفوظ ہوتی رہی۔ تاریخ کے ان واقعات کو ذہن میں رکھتے ہوئے موصوف جب لندن یونیورسٹی میں اردو زبان کے آغاز وارتقا کے موضوع پر لسانی تحقیق میں مصروف تھے تو ان پر یہ عقدہ کھلا کہ قدیم پنجابی اور قدیم دکنی ادب پاروں میں چند ایسی لسانی خصوصیات مشترک ہیں جن کا موجودہ اردو میں نام ونشان تک نہیں ہے۔ اس طرح ان متون کے مطالعے سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ مشابہتیں دونوں زبانوں کے مابین قریبی تعلقات کا پتہ دیتی ہیں۔ اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو نہ تو پنجابی سے بنی ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اردو اس زبان سے وجود پذیر ہوئی ہے جو ان دونوں زبانوں کا سرچشمہ کہی جاسکتی ہے۔ اس سرچشمہ کی شکل میں وہی زبان تھی جو کبھی شمال سے دکن حکمرانوں اور ان کے عملہ کے ساتھ وہاں پہنچی تھی۔

---

[۲۷] ہندوستانی لسانیات : محی الدین قادری زورؔ، ص ص۔ ۹۷، ۹۸

ڈاکٹر زورؔ اپنے اس خیال کی شرح مذکورہ تصنیف کے علاوہ اپنے مضامین اور تحریروں میں مسلسل کرتے رہے۔ ان کے اس خیال سے اکثر ماہرین نے اختلاف کیا ہے مسعود حسین خاں نے اپنے تحقیقی مقالہ ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' میں اور شوکت سبزواری نے اپنی تصنیف ''داستان زبان اردو'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ پنجابی اور اردو کی مشابہتوں پر تجزیاتی بحث کی ہے۔ یہ حضرات ان دونوں زبانوں کی مماثلتوں اور مشابہتوں کے معترف تو ہیں لیکن ان بنیادوں پر اردو زبان کی ابتدا کا نظریہ جس پر شیرانی اور زورؔ نے اصرار کیا ہے اسے یکسر مسترد کرتے رہے۔ ان حضرات کی گفتگو گذشتہ صفحات میں پنجابی اور اردو کی روشنی میں شیرانی کے نظریہ کے تحت پیش کی جا چکی ہے۔ اس سے ان کے رویے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ پروفیسر گیان چند جین نے زورؔ کے اس نظریہ کی تنقید کرتے ہوئے چند بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں جن سے اردو زبان کی تاریخ میں دلچسپی رکھنے والا ہر فرد واقف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ڈاکٹر زور نے اپنے مفروضے یا قیاس کی کوئی دلیل نہیں دی کہ پشاور تا الہ آباد ایک زبان بولی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وسطی ہند آریائی دور میں اس علاقے میں مختلف اپ بھرنشیں اور اس سے قبل مختلف پراکرتیں رائج تھیں اور بہت پیچھے جایئے تو سنسکرت دور میں بھی شمال مغربی ہندوستان کی سنسکرت بولی کو ادیچیہ اور مغربی ہند کے علاقے کی سنسکرت بولی کو مدھیہ دیشیہ کہا جاتا تھا۔ جب سنسکرت دور میں صوبۂ سرحد اور دہلی کی بولی مختلف تھی تو ڈاکٹر زورؔ کا یہ کہنا کہ گیارہویں بارہویں صدی میں پشاور تا الہ آباد ایک زبان رائج تھی قیاس آرائی کو تحقیق کے نام سے گزارنے کی کوشش ہے۔''[۲۸]

اس اقتباس کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی سوا اس کے کہ بہر حال اس موضوع پر اپنی نوعیت کی یہ پہلی معتبر تصنیف ہے اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے سنگ میل کا رتبہ حاصل ہے۔

---

۲۸ اردو زبان کی تاریخ : مرزا خلیل احمد بیگ، ص ص۔ ۴۶، ۴۷

اس کتاب کے آخری ابواب میں ہندوستانی کے ارتقا کی سہ مرکزی تقسیم اور اس کے اختلاف کے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ تحریک مظہر جان جاناں اور اس کے نتائج اور لکھنؤ کی خدمات کے بیان پر ہندوستانی کی ہمہ گیری کا باب تیار کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اردو اور ہندی کے جھگڑے کے اسباب اور ان کے نتائج سے بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی اردو کی ضرورتیں بیان کی گئی ہیں۔

مسعود حسین خاں ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء میں قائم گنج اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ۲۹ وہ ایک بڑے محقق اور ماہر لسانیات ہیں۔ ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' ان کا گراں قدر کارنامہ ہے اس مقالہ پر ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انہیں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ یہ مقالہ ان کی تحقیقی کاوشوں اور موضوع سے بے پناہ دلچسپی کا قابل قدر نتیجہ ہے۔ اسے کتابی شکل میں پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں دہلی سے شائع کیا گیا۔ اس میں پیش کیے گئے اردو زبان سے متعلق خاص نظریہ کے حوالے سے موصوف کو علمی حلقوں میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں اردو زبان کے عہد بعد ارتقا کی تاریخ اور اس کی ابتدا سے متعلق مختلف لسانی نظریوں کا جائزہ اور اردو زبان سے متعلق نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر اب تک اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع کیے گئے۔ اس درمیانی مدت میں نئی معلومات کے پیش نظر مصنف نے اس میں خاصی تبدیلیاں اور اضافے کیے۔ بلکہ اس کا تیسرا باب از سر نو لکھا اور ساتھ ہی اردو کے ماخذ کے بارے میں نظریاتی ترمیم بھی کی۔ اس کے علاوہ موصوف اردو زبان کی اہمیت اور اس کے مسائل پر متواتر لکھتے رہے اور اس موضوع سے متعلق ایک بڑا سرمایہ قارئین کے سپرد کیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو ان کے بہت سارے مضامین وقتاً فوقتاً مجموعے کی شکل میں ''شعر و زبان، اردو زبان و ادب اور مقالات مسعود'' کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آتے رہے۔ ان کے علاوہ مسعود حسین خاں کے صحافتی مضامین جو ''ہماری زبان'' کے اداریوں اور انشائیوں کی شکل میں مختلف اوقات میں منظر عام پر آتے رہے یہ علمی اور لسانی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے اور پسند کیے گئے۔ اردو زبان کی اہمیت اور اس کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے انہیں خوب سراہا۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے ان اداریوں کو مرتّب کیا اور کتابی شکل میں ''اردو کا المیہ'' کے نام سے شعبۂ لسانیات سے شائع کرایا۔ ان کے مطالعے سے اردو سے متعلق ایک طرح کا شعور بیدار ہوتا ہے جس سے ان کی افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح

---

۲۹ وُرُودِ مسعود۔ خودنوشت سوانح عمری : مسعود حسین خاں، ص۔۶

مستقل طور پر زبان اور علم زبان سے بالعموم اور اردو زبان و ادب اور اس کے مسائل سے بالخصوص وابستہ رہ کر موصوف نے نئے علوم کی روشنی میں تصانیف کا بیش بہا سرمایہ مہیا کر دیا ہے۔ یہاں اب تک کی گفتگو مسعود حسین خاں کی زبان اور اس سے متعلق خدمات پر مرکوز رہی ہے جب کہ موصوف کئی حیثیتوں سے علمی و ادبی حلقوں میں مشہور ہیں۔ مالک رام اپنی ایک تحریر میں مسعود حسین خاں کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''مسعود حسین خاں صاحب کسی ایک ہی فن کے نہیں، کئی فنون کے مولا ہیں، وہ نقاد ہیں، محقق ہیں، ماہر لسانیات ہیں، دکنی زبان (قدیم اردو) کے پارکھ ہیں، لغت نویس ہیں، ماہر تعلیم ہیں شاعر ہیں، نثار ہیں اور خدا معلوم کیا کیا۔ انہوں نے ہر میدان میں اپنا ڈنکا بجایا ہے اور اہل نظر نے اس کا اعتراف کیا ہے۔''[۳۰]

بحیثیت مجموعی اس طویل گفتگو کا ایک پہلو یہ بھی ہے جسے ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جہاں ایک جانب مسعود حسین خاں نے اپنے (Professional Career) کا بیشتر وقت یعنی ۱۹۴۳ء سے ۱۹۶۸ء تک اردو کے استاذ کی حیثیت سے گذارا ہے وہیں اپنی پختہ ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ تدریسی زندگی کے آخری ایام میں ۱۹۶۸ء تا ۱۹۸۱ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں بانی صدر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ ایک طویل مدت تک درس و تدریس کے شغل اور علمی اور ادبی سرگرمیوں سے وابستگی کسی کی شخصیت کو ہمہ جہت بنانے کے لیے کافی ہوسکتی ہے۔ یہاں مسعود حسین خاں کا ذکر ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور ان کی تصنیف ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' اس گفتگو کا بطور خاص موضوع ہے۔

اردو زبان جب اپنی نشو نما اور ارتقا کے تقریباً تمام مراحل طے کر چکی اور ایک مکمل شکل میں اپنی شناخت قائم کر چکی تو اہل علم کے نزدیک اس کی ابتدا اور اصل کا سراغ ایک اہم موضوع بن گیا۔ گذشتہ صفحات میں اس نوع کی متعدد تحریروں اور تصانیف پر گفتگو پیش کی گئی ہے۔ مسعود حسین خاں کی '' مقدمہ

---

۳۰؎ پروفیسر مسعود حسین خاں: علمی، لسانی اور ادبی خدمات، ص۔۷: مرتب: ایم حبیب

تاریخ زبان اردو'' بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔انہوں نے اس مقالہ میں ۱۵۰۰قبل مسیح سے لے کر اب تک کی اردو زبان کی تاریخ بڑے سائنٹفک انداز میں پیش کی ہے۔یوں تو زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا ہر طالب علم اجمالی طور پر اتنی بات جانتا ہے کہ اردو کا ارتقا ہند آریائی سے ہوا ہے اور ہند آریائی شاخ کا براہ راست تعلق زبانوں کے ہند یوروپی خاندان سے ہے۔لیکن اس اجمال کی تفصیل زبانوں کے لسانی تسلسل کو ملحوظ رکھ کر اس کے ارتقا کی نشاندہی کرتے ہوئے بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے جسے موصوف نے بخوبی انجام دیا ہے۔سب سے پہلے مصنف نے ہند یوروپی قوم کے ابتدائی مسکن کا تعین کرتے ہوئے دنیا کے مختلف علاقوں میں ان کی توسیع کا واقعہ تاریخ کی روشنی میں بیان کیا ہے۔مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آریا وسطی ایشیا کے باشندے تھے اس خیال کی توثیق ان کی زبان کے حوالے سے ہی ہوتی ہے۔اس قوم کی ایک شاخ تقریباً ۱۵۰۰قبل مسیح میں ہندوستان میں وارد ہوئی جنہیں مورخین نے آریوں کے نام سے یاد کیا ہے۔ ماقبل تاریخ میں ہندوستان کے اندر مختلف قومیں وارد ہوئیں لیکن یہاں کی قدیم تاریخ میں اس قوم نے اہم کردار ادا کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی یہاں کی تہذیب وتمدن کے لیے بنیادیں فراہم کی ہیں۔اس قوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث وتمحیص خالصتاً تاریخ کا موضوع ہے لیکن زبان کی تاریخ کا مسئلہ ماہر زبان کا حصہ ہے۔جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ مسعود حسین خاں کا نام ان ماہرین میں سرِ فہرست آتا ہے یہاں ان کی کتاب کا مجموعی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

مسعود حسین خاں نے اس موضوع کو پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے۔پہلا باب آریوں کے وطن اور ہندوستان میں ان کی زبان کے ارتقا سے متعلق تین ادوار،عہد قدیم،عہد وسطیٰ اور عہد جدید کی تاریخ پر مبنی ہے۔اس باب میں ہند آریائی زبان کی قدیم تاریخ کا سرا رگ وید سے اٹھایا گیا ہے کیوں کہ اس زبان کا مستند نقش سب سے پہلے یہیں نظر آتا ہے۔رگ وید کی تالیف اور تدوین تک ہند یوروپی زبان '' ہند ایرانی'' کی منزل سے گذر کر '' ہند آریائی'' کی شکل اختیار کر چکی تھی۔اس کے مختلف حصوں کی تصنیف مختلف زبانوں اور مختلف مقام پر ہوئی اس کے ابتدائی حصے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں اور آخری ابوا آٹھویں صدی قبل مسیح میں لکھے گئے۔چنانچہ مشرقی ایران سے لے کر پنجاب تک ایک لسانی ارتقا کے تسلسل

کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ۱۰۰۰ قبل مسیح سے ۶۰۰ قبل مسیح تک آریا ہندوستان میں شمالی ہند یعنی پنجاب سے لے کر مشرق میں بنگال تک پھیل گئے اس نتیجے میں صوبائی اور دیسی بولیوں کے اثر سے ان کی زبان میں صوتی، صرفی اور نحوی اختلافات پیدا ہونے لگے۔ ان کی زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہونے لگی اور اس کی تین شکلیں وجود پذیر ہوئیں۔ آریا اپنی زبان کے معاملے میں بڑے حسّاس اور کٹّر تھے انہوں نے سنسکرت کی ہر طرح حفاظت کی اور اسے منظم کیا۔ سنسکرت زبان ادب اور مذہب میں محفوظ ہوگئی لیکن عوام سے اس کا رشتہ منقطع ہوگیا۔ اسی زمانہ میں مہاتما گوتم بدھ اور مہاویر جین نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے عوامی اور مقامی بولیوں کو چنا اس طرح مذہب کا سہارا پا کر مقامی بولیاں چمک اٹھیں۔ سنسکرت کو شعوری طور پر منظّم کیا گیا تھا لیکن مقامی بولیاں جو فطری یا پراکرت کہلاتی ہیں رگ وید کی ابتدائی زبان سے زیادہ قریب تھیں۔ بدھ اور جین مذہب کی پشت پناہی سے صیقل ہو کر اس نے ادبی شکل اختیار کر لی پراکرت کی اسی ادبی شکل کو پالی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پراکرتوں کی تین شکلوں میں یہ پہلی پراکرت تھی اس زبان کے نمونے جین اور بودھ مذہب کی کتابوں اور اشوک کی لاٹوں میں ملتے ہیں۔ پالی کے بعد کی پراکرت پورے ہندوستان میں مختلف مثلاً شورسینی، پشاچی، ماگدھی، اردھ ماگدھی، اور مراٹھی کی شکلوں میں نظر آتی ہے۔ تیسری پراکرت اپ بھرنشیں کہلاتی ہیں ان کی بھی متذکرہ پانچ شکلیں ہیں اپ بھرنشوں کے ہی بطن سے جدید ہند آریائی زبانوں کا وجود ہوتا ہے۔

دوسرے باب میں جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی اور اپ بھرنش کے بطن سے مختلف بولیوں کے وجود کی مفصّل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اپ بھرنش کا لفظ بگڑی ہوئی زبان کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا سنسکرت کے بگڑے ہوئے الفاظ تحریروں میں صحیح الفاظ سے کہیں زیادہ پائے جانے لگے۔ صحیح اور بھرشٹ الفاظ پر مبنی زبان اپ بھرنش کہلاتی تھی۔ چھٹی صدی عیسوی تک اپ بھرنش تحریروں میں استعمال ہونے لگی تھی لیکن اس کی کوئی باقاعدہ شکل متعین نہیں تھی بلکہ اس کی جھلکیاں نمودار ہونے لگی تھیں اور یہ پندرہویں صدی عیسوی تک مستقل طور پر ملتی رہیں۔ ان زبانوں کے تہ نشیں جن زبانوں کے خط وخال متعین ہونے لگے وہی جدید ہند آریائی زبانیں کہلائیں۔ ہرنلے اور گریرسن نے جدید ہند آریائی

زبانوں کی گروہ بندی ان کی ساخت اور خصوصیات کی بنا پر کی ہے حالاں کہ اس سے بہت ساری لسانی گتھیاں نہیں سلجھتیں ۔ سنیتی کمار چٹر جی نے ہندوستانی زبانوں کی ساخت کے بعض اختلافات اور ان توجیحات کی بنا پر ان دونوں حضرات کی گروہ بندی کے طریقے کو مسترد کر دیا ہے۔[۳۱] مسعود حسین خاں اس سلسلے میں سنیتی کمار چٹر جی سے اتفاق کرتے ہیں اور ان کی توجیحات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذرا سی ترمیم کے ساتھ ہندوستان کے مختلف علاقوں کی بولیوں کی فہرست پیش کرتے ہیں ۔ اس میں جدید ہند آریائی کی مخصوص بولیوں مثلاً لہندا، سندھی، مراٹھی، آسامی، بنگالی، اڑیا، بہاری، پنجابی، راجستھانی، اور چند پہاری بولیوں کے علاوہ، مشرقی اور مغربی ہندی کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں اور ان تمام بولیوں کے حدودِ اربع متعیّن کرتے ہیں۔ مغربی ہندی پر ان کی خاص توجہ ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''شورسینی اپ بھرنش نے مغربی ہندی کو جنم دیا جو ۱۰۰۰ء کے قریب ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جب کوئی زبان کسی وسیع علاقہ میں بولی جاتی ہے تو اس کی یکسانیت باقی نہیں رہتی اور وہ جزوی اختلافات کے ساتھ کئی بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ مغربی ہندی بھی کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ ایسی ہی بولیوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔''[۳۲]

مغربی ہندی کی پانچ بولیاں بندیلی، ہریانی، قنوجی، برج اور کھڑی بولی جسے گریرسن ہندوستانی کا جدید نام دیتا ہے اس میں اور ادبی ہندوستانی یعنی (اردو) میں ماں بیٹی کا تعلق ہونے کے باوجود بعض اختلافات پائے جاتے ہیں ۔ اس باب میں اردو زبان کی حقیقت اور اس کی ساخت اور قواعد کو ملحوظ رکھتے ہوئے مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کے امتیازات کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس بحث سے یہ حتمی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ:

> ''اب چاہے اسے دہلوی، کھڑی بولی یا ہندوستانی کسی بھی نام سے یاد کیا

---

۳۱۔ ہند آریائی اور ہندی : سنیتی کمار چٹر جی، ص۔۱۰۵

۳۲۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو : مسعود حسین خاں، ص۔٦٦

جائے۔ اس کا علاقہ اور اس کی قدامت متعیّن کی جاسکتی ہے۔ اس کی
شناخت اپ بھرنش عہد کے ادب میں بھی کی جاسکتی ہے۔''۳۴

بحیثیت مجموعی ہندوستانی زبانوں کی تاریخ کے بین السطور میں اردو زبان کا عکس تب تک قدم بہ قدم چلتا ہے جب تک اس کے خطوط واضح طور سامنے نہیں آ گئے۔ یوں تو اس کتاب کے تمام ابواب بڑے اہم ہیں لیکن مذکورہ دو باب بنیادی نوعیت کے ہیں۔ یہاں تک اردو زبان کی ایک ایسی شبیہ متعیّن کی جا چکی ہے کہ آیندہ کی گفتگو میں اشکال کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

تیسرے باب میں اردو زبان کے ارتقا کی تاریخ تین ذیلی ابواب کے تحت پیش کی گئی ہے، یعنی ۱۲۰۰ء تا ۱۷۰۰ء تک اردو زبان کی شمالی ہند کی سرگرمیاں، ۱۳۰۰ء سے لے کر ۱۷۰۰ء تک دکن میں آزادانہ طور پر اردو زبان کی نشو نما کا حال اور پھر ۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک شمالی ہند میں اردو کے عروج کا زمانہ دکھایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اردو زبان کی ایک شناخت قائم ہو گئی تو اس کے نقوش عام طور پر مستقبل کے لیے نشان راہ کا کام دینے لگے۔ یعنی کسی بھی زبان کے مسائل کا حل اس کی پچھلی سرگذشت میں مل ہی جاتا ہے۔ زبان کے محققین نے اردو کے کھڑی بولی کی شکل کی نشاندہی اپ بھرنش کے ادبیات میں کی ہے۔ اپ بھرنش کے ادب کو 'دوہا' کا نام دیا جاتا تھا جس کے نمونے ۸۰۰ء سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اردو کا سلسلہ مغربی ہندی کی کھڑی بولی کے توسط سے شورسینی اپ بھرنش سے مل جاتا ہے اور شورسینی اپ بھرنش ۱۰۰۰ء کے قریب مدھیہ دیش کی مستند زبان تھی۔ اس طرح ان صدیوں میں قدیم ادب کی جتنی بھی دستیاب شکلیں ہیں ان سب میں اردو زبان کی قدیم شکل یعنی پیش اردو کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان ادبیات کے علاوہ ۱۱۹۲ء میں مسلمانوں کے ذریعے دہلی کی فتح ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔ اس سے قبل مسلمان حکمراں کی حیثیت سے پنجاب اور لاہور میں دو سو سال تک متمکن رہ چکے تھے۔ ۱۲۰۶ء میں شہاب الدین کا سپہ سالار قطب الدین ایبک غلام سلطنت کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد اور ان کی زبانوں کے لسانی اثرات ''زبان دہلی و پیرامنش'' پہ خاطر خواہ مرتب ہوئے۔ اردو کی ابتدا اور ارتقا کی

---

۳۴ مقدمہ تاریخ زبان اردو : مسعود حسین خاں، ص۔۲۴۱، (طبع اول۔۱۹۴۸)

تاریخ اس کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ اس طرح دہلی اور پیرامنش کی زبان کے پہلے شاعر امیر خسرو سے مثالیں پیش کرتے ہوئے اس عہد کے تمام شعرا اور علماء خواہ ان کا تعلق شمال سے ہو کہ دکن سے ان کے ادبی کارنامے ہماری تاریخوں میں محفوظ ہیں جس سے اردو زبان کی تاریخ کا پس منظر سامنے آجاتا ہے۔ اس ضمن میں بالخصوص ۱۷۰۰ء تا ۱۸۵۷ء تک کی شمالی ہند میں اردو کی صورت حال اور اس کی ادبی نوعیت کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ اس باب میں پیش کی گئی دو باتیں قابل ذکر ہیں اول یہ کے وقتاً فوقتاً تاریخی واقعات نے ہماری زبان پر کیا اثرات مرتب کیے مثلاً علاوالدین خلجی، ملک کافور کے دکن پر حملے اور محمد بن تغلق کے ذریعے پایۂ تخت کی تبدیلی، بعد میں دکن کی ان ریاستوں کی شمالی ہند کے اقتدار سے علاحدگی اور خودمختاری جس کے بادشاہوں نے اردو زبان کی بڑی خدمت انجام دی۔ سب سے آخر میں شہنشاہ اورنگ زیب کا دکن پہ قبضہ جس نے ایک بار پھر سے دونوں علاقوں کے مابین رشتہ استوار کر دیا تھا۔ دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان تمام قدیم اور جدید زبانوں کے تجزیے جس میں ہر لحظہ موجودہ اردو کی صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات کی بنیاد پر ان زبانوں میں مماثلتوں اور مشابہتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کے وسیلے سے اپنے خیال اور موضوع کی توثیق کا عمل لگاتار روا رکھا گیا ہے۔

چوتھے باب میں اردو زبان کی ابتدا سے متعلق اہم نظریات سے بحث کی گئی ہے جس میں برج اور پنجابی مخصوص ہیں۔ کسی بھی نئی عمارت کی تعمیر کے لیے پرانی عمارت کا انہدام ضروری ہے۔ اس باب میں برج اور پنجابی سے متعلق تمام نظریوں کی بڑی خوبی کے ساتھ تنقید کی گئی ہے۔ اردو برج اور پنجابی زبانوں کے مطالعے اور موازنہ سے مذکورہ نظریے مسترد کر دیے گئے ہیں اور دکنی کی لسانی خصوصیات کا نواح دہلی کی بولیوں کے ساتھ تقابل سے ایک نئے لسانی نظریے کی تشکیل کی گئی ہے۔ گذشتہ صفحات میں محمد حسین آزاد، محمود شیرانی اور محی الدین قادری زور کے نظریات پر اس باب کے حوالے سے چند باتیں نقل کی گئی ہیں جس کے ذریعے سے مسعود حسین خاں کے خیال کی وضاحت ہوتی ہے۔

پانچواں باب مصنف کے نظریہ اور اردو سے متعلق ان مواد کے ذکر کے لیے مختص ہے جن کی بنیاد پر آیندہ محققین کے لیے مزید تحقیق کا باب کھلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے تحقیق کے فیصلے حتمی نہیں ہوتے بلکہ اسباب کی

روشنی میں نتائج کا اعلان ہوتے ہیں۔قدیم مواد کی تعبیریں اور اس کی مزید تلاش وجستجو سے مسئلہ کا نیا حل پیش کیا جا سکتا ہے۔اس طرح اردو زبان کی ابتدا کا سراغ پانے کے لیے مسعود حسین خاں نے نواح دہلی کی بولیوں پر زور دیا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ دہلی تین بولیوں ہریانی، کھڑی اور برج کے سنگم پر واقع ہے۔ جمنا پار مغرب میں ہریانوی رائج ہے۔شمال مشرق میں کھڑی اور جنوب میں برج کا علاقہ ہے۔مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ اردو زبان کے ارتقا میں ان تمام بولیوں کے اثرات مختلف زمانوں میں پڑتے رہے ہیں۔ شروع میں اردو زبان کے ماخذ سے متعلق ان کی توجہ ہریانی زبان پر مرکوز تھی اور ان کا خیال تھا کہ:

''قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ہریانی کے زیر اثر ہوئی ہے۔اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں، اور جب پندرہویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھکتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا مقبول ہو جاتی ہے تو سلاطین دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعے درست ہوتی ہے۔''[۳۴]

بعد میں موصوف نے اردو زبان کی ابتدا اور اس کے ماخذ سے متعلق اپنے اس خیال میں نظریاتی ترمیم کی اور کتاب کے بعد کے ایڈیشن میں اردو کا ماخذ اور اس کا تاریخی ارتقا ہریانی کی بجائے کھڑی بولی سے دکھایا ہے۔کھڑی بولی سے متعلق مسعود حسین خاں نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان میں سے اقتباسات نقل کرنے کے بجائے ہم نے تفصیلی جائزے میں ہر لحظہ یہ ملحوظ رکھا ہے کہ موصوف کے خیالات اور نظریات من وعن واضح ہو سکیں۔اس کتاب کے بعد کے ایڈیشن میں ان کا نظریہ اس طرح سامنے آیا کہ:

''قدیم اردو کی تشکیل براہ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیر اثر ہوئی ہے۔اور جب سولہویں صدی میں آگرا دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھکتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول زبان ہو جاتی ہے تو سلاطین دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان نوک پلک برجی

---

۳۴۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو : مسعود حسین خاں،ص۔۲۴۱،(طبع اول۔۱۹۴۸)

محاورے کے ذریعے درست ہوتی ہے۔

اس لیے ''زبان دہلی و پیرامنش'' اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے۔اور

حضرت دہلی اس کا حقیقی مولد ومنشاء۔'' ۳۵

زبان دہلی اور پیرامنش سے مراد دہلی اور نواح دہلی کو بولیاں ہیں۔اس تصنیف میں پیش کیے گئے اردو زبان کی ابتدا اور اس کے ماخذ سے متعلق خیالات علمی حلقوں میں بڑی بڑی سنجیدگی سے زیر بحث لایا گیا۔اور اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ۱۹۴۸ء میں اس کتاب کی پہلی اشاعت سے تقریباً بیس سال قبل جیولز بلاک اپنی تحریروں میں اردو پر ہریانی کے اثرات کی نشاندہی کر چکے تھے۔انہوں نے یہ بھی اشارہ کیا تھا کہ ہندوستانی کے آغاز وارتقا پر غور کرتے وقت دہلی کے اطراف و اکناف کی بولیوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ان کا یہ مضمون اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ،لندن کے بلیٹن میں چھپا تھا۔اس معروضہ کی روشنی میں محی الدین قادری زور کا یہ ماننا ہے کہ اسی مضمون کو بنیاد بنا کر پوری کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ پنجابی سے توجہ ہٹا کر ہریانی کو آگے بڑھایا جائے اور کچھ اس انداز میں کتاب لکھی گئی ہے کہ پنجابی واقعی پس منظر میں چلی جاتی ہے۔۳۶ حالانکہ ڈاکٹر زور خود اپنی تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' میں اس امر کا ذکر کر چکے تھے اس سے متعلق یہاں ان کے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں:

''یہاں ایک اور بات مدِّ نظر رکھنی چاہیے کہ اردو پر بانگرو یا ہریانی زبان
کا قابل لحاظ اثر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں
انبالہ کے اطراف اس علاقہ میں بولی جاتی ہے۔'' ۳۷

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جیولز بلاک کا مذکورہ مضمون اور ڈاکٹر زور کی تصنیف یہ دونوں تحریریں مسعود حسین خاں کی کتاب سے پہلے منظر عام پر آچکی تھیں۔ایسے میں ممکن ہے کہ محض ان اشاروں نے ہی

---

۳۵ مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خاں ،ص ص۔۲۳۶، ۲۶۲ (طبع دوازدہم۔۲۰۰۲)

۳۶ مضمون اردو کی ابتدا: محی الدین قادری زورؔ،مشمولہ اردو زبان کی تاریخ: مرزا خلیل بیگ، ۔۲۵

۳۷ ہندوستانی لسانیات : محی الدین قادری زورؔ،ص۔۹۸

مسعود حسین خاں کو مہمیز کیا ہو اور انہوں نے ہریانی زبان کا لسانیاتی تجزیہ کر کے یہ کام انجام دیا ہو۔ ڈاکٹر زور، پروفیسر گیان چند جین، مرزا خلیل احمد بیگ اور دیگر کئی لوگوں نے اپنے مضامین میں مسعود حسین خاں کے اس نظریہ کو جس میں انہوں نے ہریانی زبان پر اصرار کیا ہے بحث و تمحیص کا موضوع بنایا ہے۔ جب کہ وہ خود اب اس خیال پر قائم نہیں رہے جس کا اندازہ ان کے بعد کی تحریروں سے ہوتا ہے۔

اس کتاب اور نظریہ سے متعلق مختلف ماہرین کی آرا اور ان کی تنقید و تعریض سے قطع نظر یہاں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ اس کتاب کا سب سے بڑا اختصاص اس کی قطعیت اور معروضیت ہے۔ اس میں بیان کیے گئے خیالات اور ان کی پیش کش کے اعتبار سے یہ ایک اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے تمام ابواب ایک دوسرے سے اس طرح مربوط اور پیوست ہیں کہ کسی ایک کے بغیر موضوع کی صحیح تفہیم میں بہر حال دقت پیش آسکتی ہے۔ تمام تر جزیات اور تاریخی نشیب و فراز کو ملحوظ رکھ کر کسی واقعہ یا تاریخ کا بیان ایک مشکل کام ہے۔ ایسے میں اگر لسانی گتھیاں اور پیچیدگیاں بھی شامل ہو جائیں تو یہ مشکل ترین مرحلہ ہے ان سے بخوبی نبرد آزما ہونا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ متذکرہ بالا تفصیلات کی روشنی میں مسعود حسین خاں کا نام اگر ایک زبان دان کی حیثیت سے سرفہرست رکھا جائے تو حق بجانب معلوم ہوتا ہے۔

# ہندوستانی لسانیات کا خاکہ : ۱۹۴۸ء

پروفیسر سیّد احتشام حسین نے جان بیمز کی کتاب "An Outline of Indian Philology" کا ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کر کے ایک مبسوط مقدّمہ کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں شائع کیا۔ جان بیمز کلکٹر اور مجسٹریٹ کے عہدے پر بہار اور بنگال میں عرصہ تک فائز رہا۔ بچپن ہی سے اسے زبانوں کے مطالعہ کا بہت شوق تھا اس لیے اپنے قیام کے دوران اس نے اپنی دلچسپی کے لحاظ سے اس علاقے کی زبانوں کا مشاہدہ کیا اور پورے ملک کی زبان کا خاکہ مختصر کتابچہ کی شکل میں تحریر کیا۔ جان بیمز کئی کتابوں کا مصنف ہے لسانیات اور قواعد کے موضوع پر بعض بہت اہم ہیں لیکن مذکورہ کتاب اس کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہندوستانی لسانیات پر مختصر کتابوں میں ایک مناسب مقام رکھتی ہے اور کم از کم دو معنوں میں قابل ذکر ہے۔ اول یہ کہ ہندوستانی لسانیات کے موضوع سے استفادہ اور عام معلومات حاصل کرنے کے لیے مختصر کتابوں میں یہ ایک اہم کتاب ہے۔ دوم پروفیسر احتشام حسین نے ترجمہ کے ساتھ ۶۵ صفحے کا ایک طویل اور بسیط مقدمہ شامل کر دیا ہے جو حقیقت میں اس کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیتا ہے۔

سرسری طور پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ بیمز نے اس کتاب میں زبان کے ارتقا اور اس سے متعلق بعض مسائل مثلاً خاندان السنہ کے لحاظ سے دنیا کی زبانوں کی گروہ بندی اور ہندوستانی زبانوں کی قسموں کی علاقائی اعتبار سے نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ زبان کے ارتقا کے مدارج یعنی زبان کس طرح ارتقائے لسان کی منزلیں طے کرتی ہے اس کی وضاحت کی ہے۔ ایک زبان جب وسیع علاقہ میں بولی جاتی ہے تو اس میں اختلافات اور فرق پیدا ہو نا لازمی امر ہے نتیجتاً بولیاں اپنی شناخت قائم کر لیتی ہیں۔ اس طرح کتابچہ کے ایک باب کے تحت بولیوں اور زبانوں کا فرق واضح کیا گیا ہے جو قابل ذکر ہے۔ آخر میں ہندوستان کا لسانی نقشہ پیش کیا گیا ہے تا کہ اس کے وسیلے سے مختلف علاقوں کی زبانوں کا خاکہ واضح ہو سکے۔ اس کتاب میں بیمز نے اس بات کو کئی جگہ تسلیم کیا ہے کہ ہندی ہی ملک کی سب سے زیادہ عام زبان ہے لیکن اس کے باوجود نہ تو اس کی ابتدا پر روشنی ڈالی ہے اور نہ ان بولیوں کا تذکرہ خاص طور سے کیا ہے جن کے مجموعے کا نام ہندی ہے۔ اس ''خاکے'' کے مطالعہ سے یہ بات بھی اچھی طرح ظاہر نہیں ہوتی کہ اردو کو وہ

ہندوستان کی زبانوں میں کون سی جگہ دینا چاہتا ہے۔ کہیں کہیں وہ اردو کے لیے ہندوستانی کا لفظ استعمال کرتا ہے اور کہیں ہندی بولیوں کے مقابلہ میں علمی زبان کا ذکر کرتے ہوئے اردو کو علمی زبان بتاتا اور اس کے جاننے کو تعلیم یافتہ ہونے کی نشانی قرار دیتا ہے۔ اس طرح اردو زبان کے متعلق اس کی رائے بہت واضح نہیں ہوتی۔

بحیثیت مجموعی بیمز ہندوستانی زبانوں کی تاریخ نہیں بلکہ ان کا خاکہ پیش کرتا ہے لیکن یہ کتاب ایک ترجمہ کی شکل میں منظر عام پر آئی تھی اس لیے اردو کی لسانی تاریخوں کی فہرست میں اسے باقاعدہ طور پہ شامل نہیں کیا گیا ہے پھر بھی یہاں اس اجمالی جائزہ نامناسب نہیں ہوگا۔ جیسا کے مندرجہ بالا سطور میں یہ عرض کیا گیا کہ پروفیسر احتشام حسین نے ایک مبسوط مقدمہ اس کے ساتھ شامل کر کے اہل اردو کے نزدیک اس کی اہمیت میں یک گونا اضافہ کر دیا ہے۔ فی الواقع اس ترجمہ میں شامل مقدمہ ہی مطالعہ کی چیز ہے اور اس پر کسی حد تک گفتگو کی جاسکتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بنیادی طور پر پروفیسر احتشام حسین ایک نقاد ہیں۔ اس کے علاوہ اردو زبان کی جامع اور معتبر کتاب ''اردو زبان کی تنقیدی تاریخ'' لکھ کر انہوں نے اپنا نام تاریخ ادب کے مورخین کی فہرست میں بھی درج کرایا۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے مختلف علوم پر ان کی گہری نظر اور پختہ ادبی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مقدمہ میں بھی انہوں نے موضوع سے متعلق بنیادی نوعیت کی کتابوں سے خاطر خواہ استفادہ کر کے ایک مبسوط اور جامع تحریر پیش کی ہے۔ یہ مقدمہ ہر چند ایک مستقل کتاب کا بدل نہیں لیکن اس کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں موضوع سے متعلق تمام اہم باتیں مختصر طور سے بڑے معروضی انداز میں شامل کر لی گئی ہیں۔ سب سے پہلے اس مقدمہ میں عام لسانیات کے مطالعے، اس کی اہمیت وافادیت اور جان بیمز کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ شروع میں زبان کی تعریف، اس کی ماہیت اور آغاز کے اسباب وعوامل اور نموئے زبان کے تمام لوازم کا ذکر بڑے موثر انداز میں کیا گیا ہے۔ زبان انسان کے لیے نہ صرف اظہار خیال کا ذریعہ ہے بلکہ وہ ایک سماجی اور معاشرتی عمل ہے ایک کے بغیر دوسرے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ انسان زبان معاشرے میں سیکھتا ہے اور وہ اسی میں پروان چڑھتی ہے۔ اس لیے اس بات پر بار بار اصرار کیا گیا ہے کہ زبان کی ابتدا، ارتقا اور زوال کی کہانی اس کے مخصوص لسانی، سماجی اور تاریخی پس منظر میں پڑھنی چاہیے۔ ان کا ماننا ہے کہ لسانیات کے مطالعہ میں دو طریقے تاریخی یا تقابلی لسانیات اور توضیحی یا تجزیاتی لسانیات رائج ہیں۔ سلسلۂ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے دنیا کی زبانوں کی درجہ بندی کے طریقے اور ان کے ذریعے سے ان کی گروہ بندی کے عمل کا ذکر کیا گیا ہے۔ دنیا کی آٹھ

لسانی خاندانوں میں ہند یوروپی کی ہند آریائی شاخ کا ذکر وہ بطور خاص کرتے ہیں کیوں کہ اردو، ہندی کا سلسلۂ نسب اسی سے ملتا ہے۔ ہند یوروپی خاندان کے حوالے سے ہندوستان میں آریوں کی آمد کا واقعہ وہ تاریخ کے مستند حوالوں کی مدد سے بیان کرتے ہیں اور ہندوستان میں ان کی زبان کی تاریخ کے تین ادوار پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔ یوں تو قوموں کے اختلاط کے اثرات کئی معنوں میں مرتب ہوتے ہیں لیکن سب سے واضح ذریعہ زبان ہوتی ہے کیوں کے اسی کے وسیلے سے اشتراک اور میل جول میں قرب پیدا ہوتا ہے اس لیے زبان کا مطالعہ تمدنی مزاج کے سمجھنے میں سب سے زیادہ معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور جدید ہند آریائی زبانوں پر ان کے اثرات کی روشنی میں اردو زبان کے ارتقا پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے الف کی ابتدائی صدیوں میں شمالی اور وسطی ہندوستان میں جدید ہند آریائی کی صورتحال پر اور مختلف مخصوص علاقائی بولیاں جو مغربی ہندی کی بولیوں کے ساتھ رائج تھیں سب کی صورت حال کا مختصر نقشہ ملتا ہے۔ مغربی ہند کے سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ:

''یہ زبانوں کا ایک بڑا گروہ ہے جس میں آج ہندوستانی (اردو ہندی) کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ویسے برج بھاشا، بانگرو، کھڑی بولی، قنوجی اور بندیلی اسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ بانگرو اور کھڑی بولی کو اردو ہندی کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔''[۳۸]

ہندوستان کی تاریخ کی روشنی میں کھڑی بولی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''کھڑی بولی مغربی یو۔ پی کے عوام کی بولی تھی پنجابی میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش ہو رہی تھی۔ جب دہلی میں دارالسلطنت قائم ہوا تو یہ اثر اور آگے بڑھا۔ اپ بھرنشیں خود بھی جدید ہند آریائی پراکرتوں کا ڈھانچہ تیار کر رہی تھیں۔ کھڑی بولی میں عربی فارسی آوازوں کے داخل ہونے سے ایک ایسا صوتی نظام بن رہا تھا جس میں فارسی لہجہ اور تلفظ کی کھپت بھی ہو سکے۔ اس طرح کھڑی بولی جو ادبی حیثیت سے بالکل تہی دامن تھی اور صرف بول چال کی زبان ہونے کے لحاظ سے ایک چھوٹے سے علاقے میں محدود تھی نئے لسانی عناصر جذب کر کے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔''[۳۹]

---

۳۸۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ (ترجمہ) : سید احتشام حسین، ص۔ ۵۳

۳۹۔ ایضاً، ص۔ ۵۳

متذکرہ بالا سطور سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ احتشام حسین کھڑی بولی کے اندر اردو کی جھلک اور نشو ونما دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آٹھ سو سال کی تاریخ اور ان کے اثرات پر برابر ہے۔ اپنی گفتگو کی ابتدا میں اردو زبان سے متعلق جو مقدمہ قائم کیا گیا تاریخ سے وہ اس کی سند لیتے رہے اور آخر تک یہ ثابت کرتے رہے کہ کھڑی بولی نے جو نیا روپ اختیار کیا تھا اسے شروع میں زبان دہلوی، ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ یہی زبان دکن پہنچ کر دکنی کہلائی اور گجرات میں گجری، پھر ریختہ، زبان اردو اور اردوئے معلّٰی کہی گئی۔ اس کتاب کے آخری صفحات میں اردو زبان سے بے توجہی اور قومی زبان کے مسئلہ پہ بڑی جامع گفتگو کی گئی ہے۔ ہندوستان میں جس زبان کی جڑیں آٹھ سو سال کی تاریخ میں پیوست تھیں وہ کھڑی بولی کے روپ میں ایک ایسی ہندوستانی زبان بن گئی تھی جو جغرافیائی اور محدود لسانی حد بندیوں کو توڑ کر صوبہ جاتی زبانوں کو نقصان پہنچائے بغیر مشترک قومی زبان کا کام دے رہی تھی۔ یہ قومی وحدت کی شیرازہ بندی کا بہت اہم ذریعہ تھی لیکن انیسویں صدی میں انگریزی سیاست کی وجہ سے ہندو اصلاحی تحریک کی نظر پہ چڑھ گئی۔ اور اس کی جگہ شعوری طور پر ارتقائے لسان کے راستوں سے ہٹ کر جدید ہندی کی تشکیل کی گئی۔ بعد میں تقسیم ہند کے بعد بعض سیاسی رہنماؤں نے اسی جدید ہندی کو قومی اور سرکاری زبان کا درجہ دلوایا اور اردو زبان پس پشت ڈال دی گئی۔ گفتگو کے اختتام پر اردو کے مستقبل، بقا اور ترقی کے لیے بارہ نکات پہ توجہ مبذول کرائی گئی ہے لیکن اس عمل کا سارا دارومدار اردو بولنے والوں اور ان کی رضامندی پر ہے اگر وہی نہیں چاہیں تو مستقبل کیا اور اردو کیا۔

بحیثیت مجموعی احتشام حسین نے علم لسانیات کی روشنی میں نموئے زبان کا واقعہ اور اردو زبان کی تاریخ بڑے مربوط انداز میں پیش کی ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے جیسا کہ عرض کیا گیا کہ دیباچہ ہوتے ہوئے یہ مقدمہ ایک مبسوط مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں احتشام صاحب نے اس موضوع کے تمام مطبوعہ کتابوں کا عمدہ نچوڑ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں پیش کر دیا ہے۔ مقدمہ کے بیان میں علم زبان، واقعات اور حقائق کا بڑا حسین اور دلچسپ انداز اختیار کیا گیا ہے اور یہی طریقہ اسے لسانی تاریخوں سے متعلق تحریروں میں ایک ممتاز مقام کا حامل قرار دینے کے لیے کافی معلوم ہوتا ہے۔

●●●

# باب پنجم

## اردو کی لسانی تاریخیں: بیسویں صدی کے نصف آخر میں

اردو زبان کے آغاز وابتدا اور اس کی تاریخ پر باقاعدہ اور سائنٹفک انداز میں تحقیق بیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوئی اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔ ماہرین نے اس موضوع پہ خاطر خواہ توجہ صرف کی جس کے نتیجے میں اردو زبان کی تاریخ سے متعلق ایک وقیع سرمایہ جمع ہوگیا۔ اس سو سال کے عرصے میں بیشتر مصنفین نے اردو کے ماخذ اور اس کی تاریخ پر توجہ صرف کی تو بعض اپنی تحریروں میں اردو لسانیات اور اس سے متعلق نظریات کی گتھیاں سلجھانے اور اس کی تفہیم میں سرگرم رہے۔ اس اعتراف کے ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ جس انداز کا کام اس صدی کے نصف اول میں ہوا وہ معیار ۱۹۵۰ء کے بعد کی تصانیف میں بڑی حد تک برقرار نہیں رہا بلکہ بعض مصنفین نے تو اپنی شناخت منوانے کے لیے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر کرنے کی کوشش کی اور اردو سے متعلق عجیب وغریب خیالات پیش کیے مثلاً اردو اڑیسہ میں پیدا ہوئی، یا اردو کا مولد دکن کی سرزمین اور مالابار کے سواحل ہیں ان پر گفتگو آیندہ کی جائے گی۔ اس طرح ۱۹۵۰ء کے بعد اردو زبان کی تاریخ سے متعلق متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں لیکن ان میں معدودے چند کے علاوہ بیشتر قابل اعتنا نہیں ہیں۔

کسی موضوع پر تحقیق اور بحث وتمحیص بند ہونے سے مزید معلومات کے امکانات کے سد باب کا خطرہ بہر حال لاحق ہوتا ہے۔ اس لیے اس نوع کی کسی بھی تحریر سے اغماز برتنا اس کی اہمیت سے انکار کے مترادف ہے۔ پچھلے باب میں بیسویں صدی کے نصف اول کی تصانیف کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جا چکا ہے۔ اس گفتگو سے اردو زبان کی تاریخوں اور اس میں اختیار کی گئی روش کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی تسلسل میں آیندہ ۱۹۵۰ء کے بعد کی تحریروں کا ذکر نامناسب نہیں ہوتا، لیکن اس مخصوص روش کو ممیّز کرنے کے لیے ہم نے ایک الگ باب قائم کیا ہے۔ اگر ہم صرف بیسویں صدی میں منظر عام پر آئی کتابوں اور تحریروں کی درجہ بندی کریں تو ان کی تین نمایاں شکلیں نظر آتی ہیں۔ اول اردو کی باقاعدہ لسانی تاریخیں، دوئم عام ہندوستانی لسانیات کے موضوع کی کتابیں جن میں ضمناً اردو زبان کی ابتدا اور اس کے مولد ومنشا پر گفتگو کی گئی ہے اور سوئم

چند ایسی تحریریں جو وقتاً فوقتاً رسائل اور جرائد میں شائع ہوئیں۔ ایسی متنوع تصانیف اور تحریروں کی موجودگی میں اپنے موضوع کے اعتبار سے انہیں شامل کرنے میں بڑی کشمکش کا معاملہ درپیش رہا ہے کہ ان میں سے کون موضوع کے عین مطابق ہے اور کون ہمارے دائرۂ مطالعہ سے باہر کی چیز ہے۔ یعنی جیسے جیسے وقت گذرتا گیا ماہرین اور مصنفین کی توجہ اردو کی تاریخ کی جانب سے ہٹ کر عام اردو لسانیات پر زیادہ صرف ہونے لگی۔ اس کے باوجود ان تمام دستیاب تصانیف اور تحریروں کا ان کی اہمیت کے اعتبار سے تفصیلی اور غیر تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا تا کہ زیر بحث موضوع کے دائرۂ کار میں ان کا احاطہ ممکن ہو۔

## اردو زبان کا ارتقا : ۱۹۵۶ء : ڈاکٹر شوکت سبزواری

بیسویں صدی کے نصف آخر کی پہلی تصنیف شوکت سبزواری کی ''اردو زبان کا ارتقا'' ۱۹۵۶ء میں منظر عام پر آئی۔ موصوف نے اس کتاب پر ڈھاکہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے اردو لسانیات اور زبان کی تاریخ پر قابل توجہ کام کیا ہے۔ ان کی پہلی تصنیف ''اردو کا ارتقا'' کے بعد دوسری کتاب ''داستان زبان اردو'' کی ۱۹۶۱ء میں اشاعت عمل میں آئی۔ یہ اول الذکر سے زیادہ بہتر ڈھنگ سے لکھی گئی ہے اس لیے علمی حلقے میں سراہی بھی گئی۔ اس کے علاوہ لسانیات اور اردو زبان کے موضوع پر ان کے تحریر کردہ مضامین کے دو مجموعے ''اردو لسانیات'' اور ''لسانی مسائل'' کے نام سے شائع ہوئے جو عام لسانیات کے موضوع پر بہت اہم ہیں۔ لیکن یہاں ان کے آخر الذکر مجموعوں سے قطع نظر دونوں مستقل کتابوں کے حوالے سے گفتگو کی جائے گی۔

اپنی پہلی تصنیف ''اردو زبان کا ارتقا'' میں موصوف نے اردو زبان کے صرفی، صوتی اور نحوی سرمایے کے تحقیقی جائزے اور لسانی تجزیہ سے اردو زبان کی تاریخی بیان کی ہے۔ اس کتاب میں قدیم زمانہ سے لے کر اب تک کی اردو زبان کی عہد بعہد کی تبدیلیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کے ماخذ کا پتہ لگایا گیا ہے۔ یہ کتاب تمہیدی اور تحقیقی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ تمہیدی حصے میں تین ابواب ہیں پہلے باب میں زبانوں کی تقسیم کے لسانی طریقے اور اس کی دو قسمیں صوری (Morphological) اور نسلی (Genealogical) کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی صورت میں زبانوں کی عام ترکیبیں یا تشکیلی صفات کے پیش نظر زبانوں کے جدا جدا زمرے یا

گروہ بنائے جاتے ہیں۔ دوسری کے تحت زبان کی بناوٹ، لفظوں کے اخذ واشتقاق، صرفی اورنحوی تغیرات وغیرہ دیکھے جاتے ہیں اوران مماثلتوں کی بنیاد پر انہیں ایک گروہ یا خاندان میں رکھ دیا جاتا ہے۔اس طرح پہلے حصے کے پہلے باب میں زبانوں کے خاندان اوران کے شجرے پیش کیے گئے ہیں۔دوسرے باب میں ہند آریائی کی تاریخ اوران کے مختلف ادوار کا خاکہ پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی ان تینوں ادوار کی زبانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔تیسرے باب کی تمہید میں دوسرے باب کا خلاصہ خود مصنف نے پیش کیا ہے جس کا ذکر یہاں ضروری ہے:

> ''(۱) 'آریا قبیلے' جو مسیح علیہ السلام سے دو ہزار برس پہلے ہندوستان میں ایک زبان بولتے تھے جسے ہم قدیم ہند آریائی کہتے ہیں۔
>
> (۲) یہ قدیم زبان ترقی کے کچھ منازل طے کرنے کے بعد سنسکرت کہلائی۔
>
> (۳) سنسکرت میں صوتی اور صرفی تغیرات ہوئے تو اس نے اوّلین پراکرت یعنی ''پالی'' کا روپ اختیار کیا۔ ''پالی'' سے حسب ذیل چار پراکرتیں وجود میں آئیں۔(الف) شورسینی (ب) ماگدھی (ج) مہاراشٹری اور (د) اردھ ماگدھی۔
>
> (۴) پراکرتیں روپ بدل کر اپ بھرنشیں بنیں۔ ہر پراکرت کا اپ بھرنش روپ الگ تھا۔
>
> (۵) ہندو پاکستان کی موجودہ بول چال کی زبانیں اپ بھرنش کی پیداوار ہیں۔''[۱]

اس خلاصہ کے بعد اس باب میں ہندوستان میں عہد قدیم سے جتنی زبانیں رائج تھیں ان کے لسانی ارتقا کے دو مختلف دھاروں کا تصوّر ماہرین کے حوالے سے واضح کیا ہے۔ان میں سے ایک کا تعلق سنسکرت سے قبل اور بعد کے زمانے میں رائج پراکرتوں سے ہے تو دوسرے کا پالی زبان سے جس نے سنسکرت کی موجودگی

---

[۱] اردو زبان کا ارتقا : ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۔۸۷

میں ادبی شکل اختیار کرلی تھی۔ ان دونوں دھاروں کا ذکر وہ تمہید کے طور پر کرتے ہیں اور پالی کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ''لسانی ارتقا کی دوسری کڑی پالی بتائی جاتی ہے یہ صحیح نہیں ہے۔''[۲] اس کے بعد پالی اور پراکرتوں پہ تفصیل کے ساتھ لسانی بحث اس طرح چھیڑی گئی ہے کہ کثرت بیان میں نتیجہ اخذ کرنا دشوار ہو گیا ہے کہ موصوف کس دھارے کے ساتھ بہہ رہے ہیں۔ یہاں اس کتاب سے مصنف کے چند جملے پیش کیے جاتے ہیں تا کہ ان کے رویے وضاحت کی جاسکے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''میرے مقالے کے مطالعے کے بعد اس میں غالباً شبہ نہ رہے کہ ''اردو'' شورسینی پراکرت، شورسینی اپ بھرنش اور اس سلسلے کی موجودہ بولیوں یعنی برج، ہریانی، بندیلی وغیرہ سے ماخوذ نہیں۔''[۳]

اس تمہیدی حصے کے پہلے اور دوسرے باب میں اردو کی لسانی اور صوتی خصوصیات کی نشاندہی کرنے کے بعد انہوں نے ایک بنیاد بنائی ہے اور تیسرے باب میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ:

(۱) ''اردو ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ ادلتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے اس حالت کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔

(۲) پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ 'اردو' اور 'پالی' دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی ادب، فن اور فلسفہ کی زبان ہے اور ہندوستانی روزانہ بول چال لین دین اور کاروبار کی۔ پالی ادبی درجہ کو پا کر ٹھہر گئی لیکن ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے اور بازار ہاٹ میں بولے جانے کے باعث برابر ترشتی ترشاتی اور چھلتی چھلاتی رہی۔''[۴]

---

[۲] اردو زبان کا ارتقا : ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۔۸۳

[۳] ایضاً، ص۔۱۰۴

[۴] ایضاً، ص۔۱۰۵

مندرجہ بالا سطور میں دو اقتباسات ۳ اور ۴ پیش کیے گئے جس میں نمبر ۴ کے دو حصے ہیں۔ نمبر ۳ سے موصوف کا موقف واضح ہو جاتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ کتاب کے ٹھیک ایک صفحہ کے بعد ۴ کے پہلا حصے میں دتاتریہ کیفی کے الفاظ میں یہ نتیجہ بیان کیا کہ ''اردو ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے۔'' لیکن اسی اقتباس کا دوسرا حصہ انہیں کس طرف لے جاتا ہے اس سے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ مزید اس کے تحت پالی اور اردو سے متعلق مذکورہ قیاسات کے وجوہ کئی صفحات میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے پورے سرمایہ کی ارتقائی تاریخ کا سراغ اصل مقالہ یعنی اس کے تحقیقی حصے میں پیش کیا گیا ہے۔

گذشتہ صفحات میں شوکت سبزواری کا پیش کردہ ہند آریائی کا خلاصہ اگر ذہن میں رکھا جائے کہ '' سنسکرت میں صوتی اور صرفی تغیرات ہوئے تو اس نے اوّلین پراکرت یعنی 'پالی' کا روپ اختیار کیا۔ 'پالی' سے حسب ذیل چار پراکرتیں وجود میں آئیں۔ پراکرتیں روپ بدل کر اپ بھرنشیں بنیں۔ ہندو پاکستان کی موجودہ بول چال کی زبانیں اپ بھرنش کی پیداوار ہیں۔ مذکورہ بالا نوعیت کے اقتباسات اور درمیان میں پراکرتوں اور پالی زبان سے متعلق بے شمار متضاد بیانات ایک سنجیدہ قاری کو کس حد تک الجھا سکتے ہیں شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ غالب گمان ہے کہ انہیں وجوہات کی بنا پر سیّد احتشام حسین نے خاکہ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ ''اردو کی ابتدا کا سراغ پالی میں تلاش کرنا چاہیے کیوں کہ قواعدی ساخت کے اعتبار سے اردو سب سے زیادہ اسی سے مماثلت رکھتی ہے''۵ حالاں کہ احتشام حسین کے اس خیال کی تردید شوکت سبزواری نے ''داستان زبان اردو'' کے پیش لفظ میں کر دی ہے۔ مذکورہ تصنیف کے وسیلے سے ان کے خیالات کی صحیح تفہیم بہت مشکل معلوم ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف نے اس کتاب میں اردو زبان کی نشونما کو دکھایا ہے اور اس کے صوتی، صرفی اور نحوی سرمایہ کا تاریخی جائزہ لینے کے بعد اس کے آغاز اور ماخذ کے متعلق اشارے کیے ہیں۔

---

۵ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ : سیّد احتشام حسین، ص۔ ۵۷

## داستان زبان اردو : ۱۹۶۱ء : ڈاکٹر شوکت سبزواری

مصنف کی دوسری تصنیف ''داستان زبان اردو'' ۱۹۶۱ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔اس کا موضوع خاص طور سے اردو کا آغاز ہے یعنی اس کے موجودہ خدوخال کب اور کہاں ابھرے، کن زبانوں سے اس نے کسب فیض کیا اور کن منازل سے گذر کر ارتقا کے اس درجے تک پہنچی۔اس کتاب میں ان تمام باتوں پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور اردو زبان کا تاریخی ارتقا دکھایا گیا ہے۔اس مقصد کے تحت اردو کے آغاز اور ماخذ کے بارے میں اس وقت تک جتنی کتابیں شائع ہو چکی تھیں ان پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے اور تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔اس کتاب میں مصنف کا اپنا کوئی نظریہ نہیں ہے بلکہ ان کا ماننا ہے کہ:

> ''میں وہی کہتا ہوں جو جیولس بلاک، گریرسن، چٹرجی اور دوسرے ائمۂ فن نے کہا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ اردو نے جس زبان سے ارتقا پائی ہے وہ کبھی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی۔سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت، مغربی اپ بھرنش بالائی دوآبے کی اس بول چال کی زبان کے مختلف العہد ادبی روپ ہیں۔کھڑی یا ہندوستانی (اردو) اس کی فطری ترقی یافتہ (یا بدلی ہوئی) صورت ہے۔''[۶]

اس لحاظ سے معتبر اور مستند کتابوں کی روشنی میں اردو زبان کی تاریخ پر یہ ایک اہم تصنیف ہے۔کل دس ابواب پر مشتمل یہ کتاب ۲۴۰ صفحات کو محیط ہے۔پہلا باب 'اردو' سے موسوم ہے اس کے تحت متعدد اقتباسات کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ تاریخ میں 'اردو زبان' کے کتنے نام مستعمل تھے اور ان کی وجوہات کیا تھیں۔ اردو جب اپنے خط و خال نمایاں کر رہی تھی علمی اور تحریری زبان کا درجہ اسے حاصل نہیں ہوا تھا تو اس کا کوئی مخصوص نام نہیں تھا۔شاید اسی وجہ سے ایک مستشرق کول بروک نے اپنے والد کے نام خط میں اسے مورس (

---

۶۔ داستان زبان اردو : ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۔۵

مسلمانوں کی زبان ) لکھا ہے یہ بہت اہم زبان ہے لیکن لکھی نہیں جاتی ۔شروع میں بعض نے اسے زبان ہندوستان بھی کہہ کر پکارا ہے۔لیکن جیسے جیسے اس کی نشونما ہوتی گئی اور شاعری کا چلن عام ہوا تو اسے ہندوی، دہلوی، گجری، دکنی اور پھر ریختہ کہا جانے لگا۔ان سب ناموں کے ساتھ اردو زبان کی اپنی مخصوص تاریخ وابستہ ہے۔ ناموں کے کثرت اور تنوع کی وجہ سے زبان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اردو کی شخصیت اور شناخت میں شبہہ ہونے لگتا ہے۔ اردو کا نام اسے بہت بعد میں ملا خود ہمارے ادبی سرمایے میں اس کی تفصیلات اور واضح تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے۔

پہلے باب میں اسم زبان کی حیثیت سے 'اردو' کی شناخت متعین کر لینے کے بعد دوسرے باب میں اردو کے آغاز اور اس کی خصوصیات سے گفتگو کی گئی ہے۔اردو زبان کے آغاز اور اس کی جائے پیدائش پر گفتگو سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اردو سے ہماری مراد کیا ہے؟ وہ کون سی زبان ہے جسے ہم اردو کہتے ہیں؟ اردو سے ملتی جلتی اور بھی زبانیں اردو کے پاس پڑوس میں بولی جاتی ہیں اگر ان زبانوں کو بھی اردو کے ساتھ شامل کر لیا جائے تو ان کی خصوصیات اصل سوال کے طے کرنے میں رکاوٹ پیدا کریں گی۔اس لیے اردو کے مزاج اور اس کی سرشت کے تعین کے لیے مصنف نے ایک طویل بحث چھیڑی ہے اور اس کی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ ہندوستان کو بولیوں کا عجائب گھر کہا جاتا ہے اور یہاں کی بیشتر زبانوں کو ایک زمانے سے ہندوستانی کے خانے میں رکھ کر بھی دیکھا جاتا ہے۔لیکن اردو سے کس نوع کی ہندوستانی مراد ہے گفتگو آگے بڑھانے سے پہلے مصنف نے یہ قضیہ حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کی مختلف بولیاں ہندوستانی کے نام سے پہچانی جاتی ہیں اس لیے دوسرا باب ''لسانی سرمایہ'' کے نام سے قائم کر کے سب سے پہلے ہندوستان کی مختلف بولیوں میں اردو کو اس کی خصوصیات کے اعتبار سے ممیّز اور واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔آج جسے اردو کہا جاتا ہے اس کے خط و خال اور رنگ وآہنگ سے سب واقف ہیں۔ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ موجودہ زمانے میں اردو بطور خاص دہلی اور اتر پردیش کے مغربی اضلاع میں اور اس کے علاوہ پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔لیکن ہم اس زبان کو نہیں جانتے جس سے اردو نے جنم لیا ہے یا یہ کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اردو زبان کا آغاز دہلی اور مغربی یو۔پی کے اضلاع میں ہوا یا یہ زبان اس علاقے میں کہیں اور سے لائی

گئی۔ان میں جو باتیں موجودہ حقائق کی روشنی میں ہمیں معلوم ہیں ان کے صحیح ہونے میں کوئی شبہہ نہیں بلکہ ثابت شدہ ہیں۔علم ودریافت کا صحیح اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ معلوم سے نامعلوم کی طرف قدم بڑھایا جائے یعنی جو چیزیں ہم نہیں جانتے انہیں جانی ہوئی چیزوں کی روشنی میں جاننا چاہیے۔کوئی بھی زبان اپنی خصوصیات سے پہچانی جاتی ہے اردو کی خصوصیت اس کے صرف ونحو کے مطالعے سے متعین کی جاسکتی ہے۔

(۱)مفرد الفاظ کی دو حیثیتیں ہیں تدبھو یعنی وہ الفاظ جو اپنی اصل سے کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں اردو میں استعمال ہیں۔تت سم یعنی وہ الفاظ جو اردو میں جوں کے توں اختیار کر لیے گئے ہیں۔

(۲)مرکب الفاظ بھی دو طرح کے ہیں جیسے بے ایمان، آپا دھاپی وغیرہ۔

(۳)بنیادی الفاظ یعنی مادّے جن سے اسما اور افعال اور اس کے مشتقات وضع ہوتے ہیں۔

(۴)تعمیری کلمے ان کے سہارے سے ماڈں سے افعال اور مشتقات وضع کیے جاتے ہیں جیسے نا، تا، گا وغیرہ۔

(۵)حروف ربط جیسے پر، میں، تک، کو، کا وغیرہ (۶) ضمیریں مثلاً وہ، جو، کتنا، کیسا وغیرہ

(۷)صرفی ونحوی اصول اور قاعدے جو اسما اور افعال بنانے اور الفاظ کی ترکیب وترتیب میں کام آتے ہیں۔

زبانوں کی ساخت، بنیادی اور تعمیری الفاظ، حرف ربط، اور صرفی ونحوی قاعدوں کی یکسانیت سے زبان کا تشخص قائم ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے سے کسی قدیم زبان سے قرب کی نشاندہی کی جاتی ہے۔دخیل الفاظ زبان کی ساخت پر اثر انداز نہیں ہوتے اور کسی مخصوص زبان کے ماخذ اور آغاز سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ان کی مدد سے زبان کے تعمیری دور روشنی میں نہیں آتے۔ہندوستان کی مختلف زبانوں بنگالی، گجراتی اور پنجابی وغیرہ کی طرح اردو بھی ایک آزاد زبان ہے اور اس کا ارتقا بھی اسی نہج پر ہوا ہے۔اردو کے آغاز کا سلسلہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے جوڑنا مناسب نہیں ہے۔اس طرح اردو زبان کے خط وخال اور نکھار کی وضاحت اپ بھرنش کی چند علامتوں کے حوالے سے کی گئی ہے جو بعد میں قدیم اردو میں شکلیں بدل کر رائج تھیں۔اپ بھرنش میں ''کار اور کیر'' کی علامت تعلق ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھی دکنی اردو میں یہ علامتیں اسی حالت میں ملتی ہیں جنہیں مثال کے طور پر مصنف نے پیش کیا ہے۔بعد میں یہی علامتیں چند بردائی کی پرتھی راج راسو میں ''کا اور کی'' کی شکل میں استعمال ہوئی ہیں۔ اردو کی تاریخ میں بہت سے موڑ آئے مثلاً مسلمانوں کی آمد، دخیل

الفاظ کا مسئلہ جس کے نتیجہ میں غلط فہمیاں رائج ہوئیں ان کے ازالہ کے لیے مکمل تحریر میں لسانیات کے اصول و ضوابط کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ زبان کا آغاز اور اس کا ارتقا کس نہج پر ہوتا ہے۔

تیسرے اور چوتھے باب میں اردو سے متعلق تمام نظریات کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن ان میں سے دو پر ''اردو اور برج بھاشا'' اور ''اردو اور پنجابی'' کے تعلق سے بطور خاص بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں پیش کیے گئے خیالات کا ذکر محمد حسین آزاد اور محمود شیرانی کے حوالے سے گذشتہ اوراق میں پیش کیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ باب بہت اہم ہے لیکن تکرار سے پرہیز لازم ہے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ دوسرے باب میں اردو کی اصل اور اس کے آغاز کے مسئلہ کا جا بہ جا لسانیات کی رو سے جو حل پیش کیا ہے ان معروضات کی روشنی میں ان دونوں نظریات کی بڑی خوبی سے تنقید کی ہے۔

پانچواں باب ''مولد و منشا'' کے نام سے لکھا گیا ہے اس میں مصنف نے مستشرقین اور اردو کے ماہرین کی آرا نقل کی ہے۔ موصوف پہلے ہی پیش لفظ میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ ان کا اپنا کوئی نظریہ نہیں بلکہ وہ ماہرین کے ہم خیال ہیں۔ تمام ماہرین کے خیالات سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ سب متفقہ طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اردو، ہندی، ہندوستانی ایک زبان کے کئی نام ہیں موجودہ اردو اس کی ادبی شکل ہے۔ یہ زبان کھڑی بولی کی ترقی یافتہ صورت ہے اور کھڑی بولی دہلی اور میرٹھ کی زبان ہے جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے دہلی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی۔ کھڑی بولی مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے اور مغربی ہندی شورسینی اپ بھرنش اور پراکرت سے نکلی ہے جو کبھی دوآبہ گنگ و جمن کے علاقہ میں بولی جاتی تھی۔

ان نتائج کے بعد ان کی تحریر کا انداز بدل جاتا ہے اور سب سے پہلے وہ مغربی ہندی کے وجود سے انکار کرتے ہیں اور اسے ذہنی تجرید یا منطقی اپج قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''اردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی اپ بھرنش ہے۔ اس لیے مغربی ہندی کو درمیان سے نکال کر یہ کہنا کہ اردو اپ بھرنش سے ارتقا پا کر وجود میں آئی زیادہ صحیح ہے لیکن اپ بھرنش کسی ایک بولی کا نام نہیں۔'' [۷]

---

[۷] داستان زبان اردو : ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۔۱۱۵

ہیم چندر نے شور سینی اپ بھرنش کی قواعد لکھی ہے وہ گجرات کا رہنے والا تھا۔ گریرسن نے ایک موقع سے شور سینی کو مغربی اپ بھرنش بھی کہا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس خیال کو بنیاد بنا کر اردو کی لسانی خصوصیات کا مغربی اپ بھرنش سے مقابلہ کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک دو اصول کے سوا ان میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ اس وجہ سے شور سینی پراکرت بھی اردو کے راست سلسلۂ نسب میں نہیں آتی۔ شور سینی کے اسما اور صفات ..ُو... پر ختم ہوتے ہیں اردو میں ...َا پر۔ جب کہ ماہرین کا ماننا ہے کہ مغربی ہندی جس کا ارتقا شور سینی اپ بھرنش سے ہوا ہے اس کی پانچ بولیوں میں تین بندیلی، قنوجی اور برج کے اسما اور افعال کا اختتام ..او.. پر اور باقی دو یعنی ہریانوی اور کھڑی کا ...ا... پر ہوتا ہے۔ بہر حال موصوف نے طویل گفتگو کے بعد اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی اور یہ خیال پیش کیا کہ:

> ''اردو یا ہندوستانی اپ بھرنش کے اس روپ سے ماخوذ ہے جو گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں مدھیہ پردیش میں رائج تھا۔ مغربی اپ بھرنش اس کی ادبی شکل ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، وہ بول چال کی اپ بھرنش سے مختلف ہے۔''[۸]

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے دیکھا کہ پہلے تو مصنف نے یہ اعلان کیا کہ ان کا کوئی مخصوص نظریہ نہیں ہے۔ اس کے بعد مغربی ہندی کے وجود کو یکسر مسترد کر دیا اور بعد میں شور سینی اپ بھرنش سے بھی انکار کی گنجائش نکال لی اور اردو کی ابتدا کے لیے ایک نئے ماخذ کی نشاندہی کی۔ یہاں شوکت سبزواری کے نظریے کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے مزید دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

> ''اردو ہندوستانی سے ترقی پا کر بنی جو دہلی، میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستانی دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی۔''[۹]

وہ کھڑی بولی اور ہندوستانی کو ایک ہی زبان تصور کرتے ہیں اور اردو کو اس کی ادبی شکل مانتے ہیں۔

---

۸۔ داستان زبان اردو : ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۔ ۱۲۰

۹۔ داستان زبان اردو : ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۔ ۱۰۹

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ کھڑی بولی یا ہندوستانی مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی دہلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھی۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

''ہندوستانی کے مولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب متفقہ طور سے
اسے دہلی اور میرٹھ کی زبان بتاتے ہیں۔ اردو اس کی ادبی شکل ہے اس
زبان کو یہ نام بعد میں دیا گیا جب مسلمانوں کی سرپرستی میں بول چال کی
زبان سے ترقی کر کے اس نے ادب اور شعر کی زبان کا درجہ پایا۔'' ۱۰؎

اس کتاب کے آخری پانچ ابواب اضافی نوعیت کے ہیں جن میں ماہرین کے خیالات سے کسب فیض کیا گیا ہے۔ اردو زبان کا لسانی تجزیہ کر کے اس کا ارتقا دکھایا گیا ہے جو خالص لسانیاتی بحث ہے۔ یہاں ان کی تفصیلات پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بحیثیت مجموعی موصوف نے ماہرین کے علمی سرمایے کی روشنی میں اردو کی حقیقت اور اس کی تاریخ متعین کرنے کی بہت اچھی کوشش کی ہے۔ کتاب کی زبان عمدہ ہے لیکن کثرت بیان سے مسائل کو الجھا دیا گیا ہے ایک دو قرأت سے مصنف کا منشا و مقصد سمجھنا ایک دشوار مرحلہ سے گذرنے کے مترادف ہو جاتا ہے۔

''داستان زبان اردو'' ۱۹۶۱ء کی اشاعت کے بعد اردو زبان کی باقاعدہ تاریخ پروفیسر گیان چند جین کی تصنیف ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آئی۔ اس درمیان یعنی بیسویں صدی کے نصف آخر میں لسانیات پر متعدد کتابیں شائع ہوئیں جن میں بعض میں ضمناً اردو زبان کی تاریخ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ عام طور سے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اردو زبان کی لسانی تاریخوں کے مذکور میں ایسی کتابیں بھی شامل کر لی جاتی ہیں جن کا براہ راست تعلق اردو زبان کی تاریخ سے نہیں ہوتا۔ ان سب کا الگ الگ جائزہ پیش کرنا مناسب نہیں اس لیے یہاں صرف ان کے نام اور موضوع کا تعارف ہی کافی ہوگا۔

پروفیسر عبدالقادر سروری کی تصنیف ''زبان اور علم زبان'' ۱۹۵۶ء میں انجمن ترقی اردو حیدر آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اٹھارہ ابواب پر مشتمل اس کتاب کا موضوع خالصتاً عام لسانیات ہے جس میں زبان اور اس کی

---

۱۰؎ داستان زبان اردو : ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۔ ۱۱۰

اہمیت، آغاز اور ارتقا، علم زبان اور اس کی شاخیں صوتی مطالعہ اور زبانوں کی گروہ بندی کے ضمن میں ہندوستانی زبانوں کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ زیرِنظر تالیف اپنی نوعیت کی اردو زبان میں پہلی کتاب ہے اس میں لسانیات سے متعلق تمام ضروری مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر عبدالستّار دلوی کی مرتبہ کتاب ''اردو میں لسانیاتی تحقیق''، بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس میں تمام بڑے اور مشہور ماہرین کے زبان اور اس کے مسائل سے متعلق مضامین شامل ہیں اور اس کا پیش لفظ مسعود حسین خاں نے لکھا ہے جو اس موضوع کے اعتبار سے کافی اہم ہے۔

## اردو کی لسانی تشکیل : ۱۹۷۳ء :ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

۱۹۷۳ء میں مرزا خلیل احمد بیگ کے مضامین پر مشتمل ''اردو کی لسانی تشکیل'' کا پہلا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو زبان کی تاریخ اور اس کے لسانی مسائل پر لکھنے والوں میں موصوف کا اہم مقام ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے قابلِ توجہ خدمات انجام دی ہیں، اردو زبان اور اس کے مسائل پر مؤقر رسالوں میں ان مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ موصوف مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں پروفیسر کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ انہیں اردو زبان کی اہمیت اور موجودہ مسائل سے بڑی دلچسپی ہے۔ مذکورہ کتاب ان کی مربوط فکر کا نمونہ ہے۔ علمی حلقہ میں یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی، تھوڑے ہی عرصے میں اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ زیرِنظر کتاب ۲۰۰۰ء میں طبع ہوئی تھی پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں مصنف نے اس میں دو مزید مضمون کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس کتاب میں شامل تمام مضمون ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کتاب پر ایک مجموعی نگاہ ڈالی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ اس کا پہلا مضمون اردو زبان کے آغاز اور ارتقا سے متعلق مختلف نظریات پر مشتمل ہے اور محمد حسین آزاد سے لے کر سہیل بخاری تک کے نظریوں پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں شمالی ہند میں اردو زبان کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے ارتقا کو بھی موضوع بنایا گیا ہے تا کہ ادب میں زبان اور زبان میں ادب کا باقاعدہ مشاہدہ کیا جا سکے۔ تیسرے مضمون میں دکنی اردو کے آغاز و ارتقا کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ چوتھے تا آٹھویں مضمون تک عام اردو لسانیات کے تحت اردو کی معکوسی آوازوں کا تاریخی ارتقا، سترہویں صدی کی اردو کی صوتی

خصوصیات، قدیم اردو اور ہریانی زبان کے لسانی رشتے، سرمایۂ الفاظ اور رسم خط کے عہد بعد ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نواں مضمون اردو زبان کے ہند آریائی پس منظر سے متعلق ہے۔ اس مضمون میں ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کی مختصر تاریخ کے ساتھ اردو کی لسانی حقیقت پر مدلل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ دسواں باب اردو کے عربی اور فارسی عناصر سے متعلق ہے۔ اس کتاب کا سب سے بڑا اختصاص یہ ہے کہ علم زبان کی رو سے اردو سے متعلق جتنے مسلمہ حقائق ہیں سبھی کو بڑے مرتب اور مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اندازِ تحریر بالکل آسان اور عام فہم ہے۔ موضوع سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص اس کی روشنی میں مختلف مسائل اور گتھیاں سلجھا سکتا ہے۔

اس تصنیف کے علاوہ موصوف اور بھی کئی کتابوں کے مصنف اور مرتب ہیں۔ اردو زبان کی ابتدا، ارتقا، تاریخ، تشکیل اور مسائل پر ماہرین زبان کے مضامین جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے انہیں یکجا کر کے ''اردو زبان کی تاریخ'' کے نام سے انہوں نے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ موضوع سے متعلق تمام مباحث بڑی خوبی کے ساتھ سامنے آگئے ہیں۔ مذکورہ کتاب کا پہلا ایڈیشن ایجوکیشنل بک ہاؤس نے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا تھا۔ گیان چند جین کی تصنیف ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' سے متعلق مباحث کے جائزے کے طور پر ایک مفصّل مضمون 'قومی آواز' نئی دہلی میں سلسلہ وار آٹھ قسطوں میں شائع ہوا بعد میں یہی مضمون اضافہ کے ساتھ ایک مستقل کتاب ''ایک بھاشا..... جو مسترد کر دی گئی'' کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ ان تفصیلات کی روشنی میں مرزا خلیل احمد بیگ کی دلچسپی اور ان تھک کاوشوں کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

سہیل بخاری نے اردو زبان کی تاریخ کے تعلق سے دو کتابیں تصنیف کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی پہلی کتاب ''اردو کا روپ'' اور دوسری ''اردو کی کہانی'' کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کتابوں کی اہمیت اور لسانی افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک ''اردو نہ تو پنجاب میں پیدا ہوئی نہ سندھ میں، دکن میں نہ دلّی میں، بلکہ اردو کی جنم بھومی اڑیسہ ہے۔ اردو ہند آریائی زبان نہیں۔''[۱۱] مصنف کی یہ کتاب دستیاب نہیں ہوئی تاکہ اس کے پس منظر اور پیش منظر سے واقفیت حاصل کی جا سکے۔ بہر حال اتنی بات تو کہی جا

---

[۱۱] اردو کی لسانی تشکیل : ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، ص۔۳۲

سکتی ہے کہ اردو زبان کے آغاز و ابتدا پر بہت سے عمدہ تحقیقی اور علمی جائزوں کی موجودگی کے باوجود ایسے نظریات اور مفروضات حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ان کو کسی سنجیدہ گفتگو میں شامل کرنے سے اگر پرہیز کیا جائے تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈاکٹر امیر اللہ شاہین کی ''جدید اردو لسانیات'' اس سلسلے میں ایک اہم کتاب ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۳ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ موصوف نے کتاب کی ابتدا میں زبان اور زبان کے نظریے پر بحث کی ہے۔ عالمی زبانوں کی گروہ بندی میں ہند یوروپی، سامی اور فنو اگرک صرتین خاندانوں کا ذکر کیا ہے اور انہیں سے دنیا کی دیگر زبانوں کی پیدائش کا واقعہ بتلایا ہے۔ اس کتاب کا تعلق بھی اردو کی باقاعدہ تاریخ سے نہیں ہے بلکہ ایک باب ہند آریائی کے حوالے سے بحثیت مجموعی ہندوستانی زبانوں کی تاریخ اور اس کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ اس طرح یہاں اس کتاب کے تفصیلی جائزے کی چنداں ضرورت نہیں۔

## اردو زبان کا آغاز: مختلف نظریے اور حقائق: ۱۹۹۳ء : ڈاکٹر خورشید حمرا صدیقی

ڈاکٹر خورشید حمرا صدیقی نے اپنی تصنیف ''اردو زبان کا آغاز: مختلف نظریے اور حقائق'' میں اردو کے مدھیہ دیش میں بننے کا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کے بقول چٹرجی، شوکت سبزواری، مسعود حسین خاں وغیرہ ماہر لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ آریوں کی آمد سے لے کر مسلمانوں کے فتوحات تک ہمیشہ مدھیہ دیش کی ہی کسی نہ کسی زبان کا راج رہا۔ مدھیہ دیش سے ان کی مراد وسطی ہندوستان یعنی شمال میں ہمالیہ جنوب میں وندھیاچل مغرب میں سرہند اور مشرق میں الہ آباد سے ہے۔[۱۲] ان کا خیال ہے کہ اردو کے نظریے اور تاریخ سے ابھی تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا ہے بلکہ اس طرح الجھ گیا ہے کہ اس کا سلجھنا مشکل ہے۔ اس لیے ان تمام نظریات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے بیچ کا راستہ نکالا ہے اور ایسا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ مصنفہ اپنے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماہرین کا نظریہ پیش کرنے کے لیے ان کی کتابوں سے کثرت سے اقتباسات نقل کرتی ہیں اور ان کی کڑیوں کو ملا کر اپنے لیے جواز تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بیشتر ماہرین کی آرا کے ساتھ اس امر پر اصرار کرتی ہیں کہ اس نظریے سے میرے خیال کی

---

[۱۲] اردو زبان کا آغاز : مختلف نظریے اور حقائق، ڈاکٹر خورشید حمرا صدیقی، ص۔ ۱۰

بھی تائید ہوتی ہے کہ اردو مدھیہ دیش میں پیدا ہوئی۔ مناسب یہ ہے کہ اس نظریہ پر کچھ کہے بغیر گفتگو آگے بڑھائی جائے لیکن یہاں ایک دو مسلمہ حقائق کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

جو لوگ ہندوستان میں ہند آریائی کے ارتقا سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قدیم عہد میں ویدک اور کلاسیکل سنسکرت کا تسلط ایک وسیع علاقے میں تھا اس کے باوجود اس میں واضح اختلافات موجود تھے ۔شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش تک آتے آتے یہ صورت مزید بگڑتی چلی گئی اور چھوٹے سے علاقے میں بولیوں کے اندر شدید اختلافات رونما ہونے لگے نتیجہ میں پراکرتوں اور اپ بھرنشوں کی کئی کئی شکلیں نمودار ہوئیں۔ ایسے میں جس زمانے سے اردو زبان اپنے خط وخال ابھارنا شروع کرتی ہے اس زمانے میں صرف دہلی اور نواح دہلی میں پانچ بولیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پھر اتنے بڑے علاقے سے ایک زبان کا وجود پذیر ہونا، یہ بات عقل میں نہیں سماتی۔ زبانیں بہت سی بنیں لیکن ترقی کی معراج بہت کم کے حصّے میں آئی۔ ہر ترقی یافتہ زبان کی پیدائش، عروج اور زوال کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اردو کو ہندوستان میں ''لنگوا فرینکا'' کی حیثیت حاصل تھی لیکن اب اسے حالات کی ستم ظریفی کہیے کہ اب اپنے ہی وطن میں اجنبی ہو چکی ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مصنفہ کے ذہن کے کسی خانہ میں یہ بات موجود تھی کہ بس اردو کے عروج سے اس کے آغاز کے واقعہ کو منسوب کر رہی ہوں۔

## اردو کا ابتدائی زمانہ : ۱۹۹۹ء : شمس الرحمٰن فاروقی

اردو کے مشہور ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' پہلی مرتبہ ۱۹۹۹ء میں کراچی، پاکستان سے شائع ہوئی۔ حالاں کہ اس کتاب کا موضوع ہمارے مطلب ومنشا سے بالکل مختلف ہے اور زبان کی تاریخ کے بجائے ہمیں ادب کی تاریخ کی جانب لے جانے والا ہے۔ لیکن اس کتاب کا پہلا باب'' تاریخ، عقیدہ، اور سیاست'' کے نام سے لکھا گیا ہے اور اس میں تمہید کے طور پر اردو زبان کے ایک مخصوص عہد پر خالص علمی اور تحقیقی بحث اٹھائی گئی ہے۔ اس بصیرت افروز گفتگو سے ہم نے اکثر وبیشتر استفادہ کیا ہے۔ اس حیثیت سے یہاں اس کتاب کا عمومی ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب پیش اردو سے متعلق ایک مضمون کا پس منظر، تفصیل اور اس کی وضاحت ہے جو شکاگو یونیورسٹی میں ایک خاص منصوبے کے تحت ہندوستان کی بڑی

زبانوں کی ادبی تہذیب، ادبی اور ثقافتی تاریخ سے ان کے رشتوں، ان کے آپسی روابط اور ادب کے بارے میں زبانوں میں رائج تصورات واضح کرنے کی غرض سے لکھا گیا تھا۔[۱۳] ظاہر ہے یہ مقصد ہمارے مطالعے سے باہر کی چیز ہے لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اس کا پہلا باب ہمارے لیے بہت اہم ہے۔

اردو اپنے مختلف زمانے میں مختلف ناموں سے موسوم کی جاتی رہی یہ اردو کے ارتقا کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے جسے ہم صرف زبان کی تاریخ کی حد تک سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایک وقت وہ بھی آیا تھا جب اردو زبان پوری طرح سے انگریزوں کی سیاست کا شکار ہوئی۔ چوں کہ انگریزوں کو اپنی سیاست ملک میں رائج کرنی تھی اس لیے ہماری زبان اور تہذیب کی قطعی پروا کیے بغیر انہیں اپنی حکومت اور اقتدار کی فکر زیادہ لاحق تھی۔ ملک میں قدیم زمانے سے جو زبان رائج تھی اور تاریخ میں وہ مختلف ناموں سے پہچانی گئی۔ اسے ہندوستانی اور ہندی کے نام سے ممیّز کر کے تمام مستشرقین کے ذریعے شعوری طور پر ہندوؤں کی جھولی میں ڈالنے کی کوشش کی جانے لگی۔ مجموعی طور پر اس ہندی کا ارتقا سنسکرت سے ظاہر کیا جانے لگا اور اس کی دوسری شکل جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ شامل تھے اس کے آغاز کی داستان مسلمانوں سے وابستہ کی جانے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ آخر الذکر شکل کا غیر محسوس طریقے سے فطری ارتقا ہوا، اور فورٹ ولیم کالج میں سنسکرت کے تت سم الفاظ اور دیوناگری لپی کے ذریعہ اول الذکر کی راہیں ہموار کی گئیں۔ شروع میں ہندوؤں نے خود اس رویے کو قبول کرنے میں تامل کیا۔ اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ جب اصلاحی تحریک کے زیر اثر پوری نئی لسانی روایت انیسویں صدی میں وضع کی جارہی تھی اس نئی تشکیل کو بہت خوشی سے قبول نہیں کیا گیا بلکہ لوگ اپنی مادری زبان بھی اسی ہندی کو سمجھتے تھے جس کی موجودہ شکل اردو کہی جاتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اپنی زبان سے قوموں کو ایک خاص لگاؤ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ان کا حال، ماضی اور مستقبل سب کچھ وابستہ رہتا ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا تک ہندوستانی قومیت کی صرف ایک زبان تھی لیکن سیاسی مفاد کی خاطر انگریزوں نے لسانی عصبیت کا ایسا بیج بویا جس کا تلخ اور ترش میوہ اب بھی ناقابل برداشت ہے۔ ہندوستان میں ہندو اصلاحی تحریکوں کا آغاز زبان سے ہی شروع ہوا اور اس نے کیا کیا روپ اختیار کیے۔ یہاں اس کے بیان کی ضرورت

---

[۱۳] اردو کا ابتدائی زمانہ : شمس الرحمٰن فاروقی، ص۔۹۔ (دیباچہ)

نہیں ۔ بہرحال انگریز اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ۔ اردو کی تاریخ کا ایک اہم موڑ یہ بھی ہے جسے مذکورہ تصنیف میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ کتاب (Early Urdu) کا پس منظر اور پیش منظر ہے یعنی ادب اس کا موضوع ہے۔ بعد کے ابواب شعر وادب کی تاریخ، روایات اور نظریاتی تنقید کے آغاز کے لیے مختص ہیں۔ موضوع پر مصنف کی غیر معمولی گرفت اور طریقۂ استدلال نے اردو کے اس باب کو پانی کی طرح سیّال بنادیا ہے۔

## ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب : ۲۰۰۵ : گیان چند جین

اردو زبان کی تاریخ پر لکھی گئی ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' کی اشاعت نے علمی اور ادبی حلقوں میں ایک واویلا مچا دیا۔ کتاب ۲۰۰۶ء میں جیسے ہی منظر عام پر آئی اس پر بحث وتنقید کا سلسلہ جاری ہوگیا اور شاید اردو زبان کی تاریخ میں یہ پہلی تصنیف ہوگی جس پر اس کثرت سے مضامین، تبصرے، اداریے اور خطوط شائع ہوئے اور اس کی کھل کر تردید اور مذمت کی گئی۔ اس کتاب کو لکھ کر گیان چند جین نے بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت اور بدنامی مول لے لی۔ جس نے آخری وقت تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

گیان چند جین ایک بڑے محقق، ناقد اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے اردو دنیا میں مشہور رہے ہیں۔ ایک طویل مدت تک انہوں نے اردو زبان وادب کی خدمت انجام دی ۔ان کی تصانیف اردو کی نثری داستانیں، اردو مثنوی شمالی ہند میں، لسانی مطالعے، عام لسانیات، تاریخ ادب اردو جو انہوں نے سیّدہ جعفر کے اشتراک سے لکھی اور تحقیق کا فن بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور اردو ادب کے سرمایے میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ تنقید اور تحقیق سے قطع نظر اگر ہم دیکھیں تو موصوف نے اردو لسانیات اور اور دو زبان کے موضوع پر وقیع کام کیا ہے۔ اس سے متعلق مختلف مسائل پر ان کے مضامین کے دو مجموعے ''لسانی مطالعے'' ۱۹۷۳ء اور ''عام لسانیات'' ۱۹۷۵ء میں طبع ہوئے۔ ان کے علاوہ موصوف کے دیگر مضامین جستہ جستہ مختلف اخبار ورسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ان میں بحیثیت مجموعی زبان اور علم زبان، زبان کا آغاز، زبان اور بولی کا فرق، اردو ہندی زبان کے مسائل اور حقائق، ان کے رسم خط اور اردو کے آغاز کے نظریے کے علاوہ عام ہندوستانی لسانیات کے موضوعات پر تفصیل سے لکھا ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے ان کی مربوط فکر کا

اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

اردو سے متعلق گیان چند جین کے خیال کی اگر تشریح کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی والوں کی طرح وہ اردو کو کوئی علاحدہ زبان نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہندی کا ہی ایک اسلوب مانتے ہیں۔[14] ان کا خیال ہے کہ ادب میں اس کی بیشتر مثالیں موجود ہیں جیسے رانی کیتکی کی کہانی، سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی۔ زبان کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں اور ایسا بھی نہیں کہ ایک دو جملے مماثل ہوں بلکہ پوری کی پوری کتابیں مشترک ہیں۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ کتابیں ہندی اور اردو دونوں ادب کا سرمایہ ہیں۔ مزید اردو سے متعلق ان کا خیال ہے کہ:

> ''اصل یہ ہے کہ اردو کے آغاز کی دو منزلیں ہیں۔ اول جدید ہند آریائی زبانوں میں کھڑی بولی، جو گیارہویں بارہویں صدی میں نمودار ہوئی ہوگی۔ دوسرے کھڑی بولی کے اردو روپ کی نشو نما جو بعد کا کارنامہ ہے۔''[15]

ایک دوسرے مضمون میں ان کا خیال کچھ اس طرح ملتا ہے کہ:

> ''اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں ڈھونڈنا چاہیے۔ اول کھڑی بولی کا آغاز دوسرے کھڑی بولی میں عربی فارسی لفظوں کا شمول جس کا نام اردو ہو جاتا ہے۔''[16]

لسانی مطالعے میں ہی گیان چند جین ''مشترک رسم خط'' کے عنوان سے ایک مضمون میں اردو رسم خط پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''پڑھنے کے لیے یہ خط خاصا ناقص ہے۔ یہاں ایک ایک آواز کے لیے کئی کئی حرف ہیں اور بیشتر مصوتوں کے لیے کوئی حرف نہیں۔ حرفوں کے نہایت مختصر اجزا کو ملا کر ایک جا لکھنے سے گڈمڈ ہو جانے کا کافی امکان ہوتا ہے جس

---

[14] لسانی مطالعے : گیان چند جین، ص۔۱۵۲

[15] ایضاً، ص۔۱۵۳

[16] مضمون اردو کے آغاز کے نظریے: گیان چند جین، مشمولہ اردو کی لسانی تاریخ: مرزا خلیل احمد بیگ، ص۔۵۳

کے نتیجہ میں اردو رسم خط میں جو لکھا جائے وہ اسی صورت میں صحیح پڑھا جا سکتا ہے جب کے ہم پہلے سے اس لفظ کے تلفظ اور مفہوم کو جانتے ہوں۔'' ۱۷؎

متذکرہ بالا اقتباسات کی روشنی میں اردو زبان، اس کی تاریخ اور رسم خط سے متعلق گیان چند جین کے خیالات کا ایک خاکہ بہر حال سامنے آ جاتا ہے۔ موصوف تا عمر اردو سے وابستہ رہے اور اردو زبان اور اس کی تاریخ سے متعلق ہمیشہ لکھتے اور شائع ہوتے رہے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی ان کی مبسوط اور قدرے غیر مربوط کتاب ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' جسے ان کی مخصوص سوچ اور بدلی ہوئی فکر کا نتیجہ کہنا چاہیے۔

مذکورہ تصنیف سے میں تبصروں کے ذریعے سے واقف ہوا ایسا کہا گیا کہ اس تصنیف نے گیان چند جین کی اردو سے متعلق عمر بھر کی خدمت پر پانی پھیر دیا اور اس کتاب کے باعث اردو دنیا میں موصوف معتوب ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ گیان چند جین نے اس کتاب کی تصنیف میں ایسا کون سا رویہ اختیار کیا کہ اس کی اتنی شد و مد سے مخالفت کی گئی۔ مندرجہ بالا سطور میں موصوف کے مختلف مضامین اور کتابوں کی روشنی میں ان کا رویّہ اس لیے پیش کیا گیا کہ اس کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے اردو سے متعلق ان کے پہلے کے خیالات ملحوظ رکھے جائیں۔ اوپر پیش کی گئی گفتگو کی روشنی میں ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ موصوف اس تصنیف کے لیے بہت دنوں سے ماحول سازی کر رہے تھے کیوں کے وہ اردو سے متعلق لسانی نظریوں اور اس کی حقیقت سے شاید کبھی مطمئن نہیں تھے۔

اردو زبان سے متعلق ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس زبان کا ارتقا مغربی ہندی کی کھڑی بولی سے ہوا۔ جس کی جڑیں ہند آریائی کی سیکڑوں سال کی تاریخ میں پیوست ہیں۔ انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج اور ہندو اصلاحی تحریکوں کے تحت اسی زبان میں اردو فارسی کے عام فہم الفاظ جو اس کی فطرت کے موافق رچ بس چکے تھے ان کی جگہ سنسکرت کے تت سم یعنی خالص الفاظ کے شعوری استعمال اور دیوناگری رسم خط میں لکھے جانے سے جدید ہندی یعنی موجودہ ہندی متشکل ہوئی۔ نیز یہ کہ ہندی کی شیلی اردو نہیں بلکہ اردو کی شیلی ہندی ہے اور کھڑی بولی اور اردو دونوں ایک ہی ہیں۔ اردو کو ہندی پر تقدم زمانی حاصل ہے۔ گیان چند جین کو ان حقائق

---

۱۷؎ لسانی مطالعے : گیان چند جین، ص۔ ۱۳۶

سے شدید اختلاف ہے کہ موجودہ ہندی کی تاریخ فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوتی ہے۔

کتاب کے عنوان سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان پر لکھی گئی ایک مفصل تاریخ ہے۔ لیکن مطالعے کے بعد امید کی ساری کرنیں غائب ہو جاتی ہیں اور مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ کہنے کو تو یہ کتاب اردو کی تاریخ ہے لیکن حقیقت یہ کہ پوری عمر اردو اور مسلمانوں سے روابط میں گذارنے کے بعد یہ کام ایک چینی کے ذریعہ کیا گیا تزکیۂ نفس معلوم ہوتا ہے۔

زیر نظر کتاب مع تمہید چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ محمد حسن کی تحریر ہے اور مقدمہ کمال احمد صدیقی نے لکھا ہے۔ پہلے باب یعنی تمہید سے پہلے ''حرف اول'' سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے اور آخر میں ''کلمات آخر''، ''ختم کلام'' اور ''ضمیمہ'' شامل ہے۔ حرف اول میں وجہ تصنیف بیان کی گئی ہے موصوف کو شکایت ہے کہ اردو میں اردو زبان کی تاریخ پر کتابیں یک رخے انداز میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لیے ردّعمل کے طور پر دوسرے زاویۂ سے یہ کتاب تیاّر کی گئی ہے۔ موصوف کے نظریاتی اختلاف کا ذکر مسلمہ حقائق کے حوالے سے اوپر آ چکا ہے۔ کتاب کا پہلا باب تمہید ۳۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جو لغو باتوں سے پر ہے۔ اس کے تحت ذاتی تاثرات اور من گھڑت باتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ باتیں دراصل کدورت اور عصبیت کا غبار ہیں۔ جنہیں طرح طرح کے واقعات جیسے استاد اور شاگرد کا مکالمہ کے وسیلے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں ان تفصیلات اور تجزیہ کو اس موضوع میں جگہ دینا کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ دوسرا باب طریق تحقیق پر مبنی ہے اور جا بجا اپنی کارگزاریوں کا ذکر کیا ہے۔ دو ابواب یعنی ۵۵ صفحات کے بعد بھی سوائے بغض و کینہ کے کام کی باتیں نظر نہیں آتیں۔ تیسرے باب کے عنوان ''اردو اور ہندی کے آغاز کی تلاش اور اردو محققین'' سے امید کی کرن نظر آئی کے شاید یہاں کچھ کام کی باتیں موجود ہوں۔ لیکن اس میں مختلف تحریکوں مثلاً وہابیت، شاہ ولی اللہ کی تحریک، شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی کی تحریک، تحریک اتحاد اسلامی وغیرہ میں کیڑے نکالے گئے ہیں۔ اس طرح یکے با دیگرے تمام عنوانات سے یہی دھوکہ ہوتا ہے کہ شاید کوئی علمی بحث ہوگی۔ لیکن افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بحثیت مجموعی صرف دو باتوں کے حوالے سے اس کتاب پر تھوڑی دیر گفتگو کی جا سکتی ہے اول یہ کہ لسانیاتی اعتبار سے اردو ہندی ایک ہی زبان ہے جسے کے لیے دو ابواب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

دراصل اس تفصیل میں ہندی نہیں بلکہ اردو ہی شامل ہے۔ لیکن ہندی کے عینک سے حقیقت کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اردو کو مسلمان اپنے ساتھ نہیں لائے تھے بلکہ اردو کے بنیاد گذار اور اولین معمار ہندو ہیں۔ ایک تیسری اور اہم بات جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے کہ انہیں اس بات سے اختلاف ہے کہ جدید ہندی کا ارتقا فورٹ ولیم کالج کی کوششوں سے ہوا۔ آٹھویں باب میں اس پر گفتگو کی گئی ہے۔ بحثیت مجموعی یہ کتاب اردو کی تاریخ کم اور بقول شمس الرحمٰن فاروقی جیسے یہ کتاب نہیں بلکہ وشو ہندو پریشد اور آر۔ ایس۔ ایس کا منشور ہو۔ شروع میں اس کتاب سے متعلق یہ تاثر برابر قایم رہا کہ تاریخ چاہے جتنی بھی مسخ کی گئی ہو یہ کتاب بہر حال زبان کی تاریخ سے متعلق ہے، اس لیے ہمارے موضوع سے علاقہ رکھتی ہے۔ لیکن اس کے مطالعے کے بعد طبعیت مکدر اور بوجھل ہو جاتی ہے۔ میرے موضوع سے اس کتاب کی کوئی مطابقت نہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو نامناسب نہیں ہوگا کہ کسی علمی کتابوں کے ذکر میں اس نوعیت کی تصانیف کا شامل کرنا قطعی زیب نہیں دیتا۔ جس طرح اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس کی رد اور مذمت میں تبصرے اور مضامین شائع کیے گئے بلکہ مرزا خلیل احمد نے اپنے اعتراضات پر مبنی ایک مفصّل کتاب شائع کی۔ اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اردو سے متعلق مسائل اور مباحث سے بہت ساری لسانی گتھیاں مزید کھل گئیں اور بعض باتیں زیادہ روشن ہوئیں۔ لیکن ان کاموں کے لیے کوئی دوسری تقریب تلاش کی جاتی اور اس کتاب کو نظر انداز کیا جاتا تو برا نہیں ہوتا۔ کیوں کے اس طریقے سے بھی لوگ اس سے واقف ہوئے اور یہ کتاب اس مصرعے کا مصداق ہوگئی۔

ع بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

●●●

# نتائج کا محاکمہ

کسی بھی علم کی بقا کا انحصار مباحثہ پر ہے اور اس کا آغاز موضوع کے تعیّن کے بعد ہی ممکن ہے۔ جیسے جیسے اردو زبان کے خط و خال متعین ہوتے گئے ویسے ویسے اس سے متعلق مسائل پر گفتگو کا باب وا ہوتا گیا۔ آج سے تین سو سال قبل جب اس زبان میں با قاعدہ ادب تخلیق ہونے لگا تب اس کا نام اردو نہیں تھا بلکہ شروع میں اہل علم کے نزدیک یہ ہندوی، ہندی، دہلوی، گجری، دکنی اور پھر ریختہ کے نام سے جانی جاتی تھی۔ ان تمام ناموں میں اردو نسبتاً نو عمر ہے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے اردو زبان کا تعلق اور تشخص شعر و ادب کے ذریعہ سے واضح کیا جانے لگا۔ مصحفی کا ایک شعر ہے:

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

ظاہر ہے یہ شعر مصحفی متوفی ۱۸۲۴ء کا ہے اور کئی اعتبار سے یہ ثابت شدہ ہے کہ انھوں نے اسے ۱۷۸۱ء سے پہلے کہا ہے۔ اس شعر کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو اس زمانے میں ایک معیاری زبان کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکی تھی۔ اس کی مزید تفصیل ''باغ و بہار'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جب ۱۸۰۱ء میں میر امن دہلوی کو فورٹ ولیم کالج میں یہ ہدایت دی گئی کہ ''قصۂ چہار درویش'' کا ترجمہ خاص ہندوستانی زبان میں کی جائے جو دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ انشا اللہ خاں انشا نے ''دریائے لطافت'' میں دہلی کو تہذیب و شائستگی کا گہوارہ کہا، وہاں کی زبان کو اردو سے موسوم کیا اور اسے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لیے سند قرار دیا۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ ہر خاص و عام کو اپنی زبان اور ادب سے ایک خاص قسم کی وابستگی ہوتی ہے، اہل علم کے نزدیک یہ معاملہ اور زیادہ سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

اردو زبان نے جب اپنی شناخت خود قائم کر لی تو اہل اردو نے اپنی مختلف نوعیت کی تحریروں میں اس زبان کو دوسری زبانوں سے ممیّز کرنے، اس کا تعارف کرانے اور اس کی مختصر تاریخ بیان کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدا میں جب اردو زبان کا تعارف کرایا جاتا ہے اور اس کی تاریخ رقم کی جاتی ہے تو ایک خاص انداز ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ سیّد انشا نے تو اپنی زبان کو ممیّز کرنے کے لیے یہاں تک کہا کہ ''شاہ جہاں آباد کے خوش بیانوں

نے متفق ہو کر متعدد زبانوں سے اچھے اچھے لفظ نکالے اور بعض عبارتوں اور الفاظ میں تصرف کر کے اور زبانوں سے الگ ایک نئی زبان پیدا کی جس کا نام 'اردو' رکھا۔'' پوری انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی کچھ دہائیوں تک اردو میں ''اردو ادب کی تاریخ'' یا ''اردو قواعد'' وغیرہ سے متعلق زیادہ تر کتابوں میں 'اردو زبان' کی حقیقت، اس کی پیدائش اور تاریخ کا بیان ملتا ہے۔ ان تحریروں کے اثر سے عوام کے درمیان یہ نظریہ عام رہا کہ اردو ایک ملغوبہ زبان ہے جس کی ابتدا ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد فارسی، ترکی، عربی، اور ہندوستانی زبانوں کی آمیزش سے ہوئی اور اس کے ارتقا میں بیش از بیش مسلمانوں کا عمل دخل رہا ہے۔

اردو زبان کی لسانی تاریخوں پر جب بھی گفتگو کی جائے گی تو مذکورہ بیانات کے مقابلہ میں اس کا منظر نامہ یکسر تبدیل ہو جائے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ لسانیات ایک جدید شعبۂ علم ہے۔ اس کے تحت زبان کا سائنٹفک مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ لسانیات کے دائرۂ کار میں زبان کی اصل، اس کی ابتدا اور ارتقا کی تاریخ کا مسئلہ زیر بحث ہوتا ہے۔ یوں تو زبانوں پر گفتگو کم و بیش ہمیشہ ہوتی رہی ہے لیکن جدید لسانیات کی عمر زیادہ نہیں۔ سر ولیم جانس نے اپنا ایک مقالے میں، جو اس نے ۱۷۸۶ء میں رائل اشیاٹک سوسائیٹی کلکتہ کے جلسے میں پڑھا تھا سنسکرت، یونانی، لاطینی، اور فارسی زبانوں کے غائر مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے الفاظ اور ان کی مماثلتیں ان کے آپسی رشتے کا پتہ دیتی ہیں، اس لیے ان دلیلوں کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ یہ کہی جا سکتی ہے کہ یہ مختلف زبانیں کسی ایک قدیم ماخذ سے ارتقا پذیر ہوئی ہیں۔ اس علمی انکشاف نے زبان کے متعلق سوچ کی نہج ہی تبدیل کر دی اور اس کے اثر سے یوروپ میں باقاعدہ تقابلی لسانیات کی بنیاد پڑی۔ اسی نقطۂ نظر سے دنیا کی زبانوں کی لسانی گروہ بندی کی گئی اس کے تحت ہم رشتہ زبانوں کو کسی ایک خاندان سے وابستہ کیا گیا۔ تقابلی لسانیات، تجزیاتی اور نوعیاتی لسانیات کی طرح جدید لسانیات کی ایک شاخ ہے۔ زبانوں کے مطالعہ کا رجحان تاریخ میں نئی بات نہیں اسے قدیم زمانے میں یونان اور روم کے مفکرین نے بھی موضوع بحث بنایا تھا اور کے خیالات میں بعض بڑے پتے کی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں، لیکن جس علم کو جدید لسانیات کا نام دیا گیا اس کا آغاز تقریباً ۱۹۲۵ء میں پراگ اسکول میں ہوا۔ اس نئے علم کی روشنی میں زبانوں کا مختلف جہتوں سے مطالعہ شروع ہوا اس کی تاریخیں متعین کی گئیں اور بعض مفروضوں پر قائم تمام عمارتیں خود بخود منہدم ہو گئیں۔

میر امن کی ''باغ و بہار'' سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول میں ''نقوش سلیمانی'' (۱۹۳۹ء) تک تقریباً ایک ہی نوعیت کی تحریریں ہیں جن کی تکرار عام طور پر اردو زبان کی ابتدائی تاریخوں کے ضمن میں ہوتی ہے۔ان تحریروں اور نثر پاروں کی اہمیت ہمارے لیے مسلم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کی لسانی تاریخوں کے ضمن میں انہیں اعتبار حاصل نہیں۔ پھر بھی ابتدائی نمونوں کے طور پر تمام ماہرین نے ان پر روشنی ضرور ڈالی ہے۔ ابتدائی تحریروں سے لے کر بعد کی تحریروں تک وقت کے ساتھ ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان تحریروں کا معیار بلند ہوتا جاتا ہے۔ میر امن کی ''باغ و بہار'' ۱۸۰۱ء سے مولانا محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' تک انداز بالکل بدل جاتا ہے۔آب حیات سے پیشتر کی تحریروں میں صرف ایک ہی انداز نمایاں ملتا ہے کہ اردو ایک ملغوبہ یا ملواں زبان ہے۔ محمد حسین آزاد نے اس سے ایک قدم آگے بڑھایا اور اردو کی ابتدا کا سراغ کسی ایک بولی میں ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ غیر سنجیدہ نظریہ ہوتے ہوئے بھی ایک زمانے میں برج بھاشا اور اردو کے تعلق کی بڑی دھوم رہی اور مدتوں لوگ یہی سمجھتے رہے کے اردو کا ارتقا برج بھاشا سے ہی ہوا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس نوع کی علمی گفتگو میں ایسی تحریروں سے احتراز برتنا چاہیے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کے یہ تحریریں کسی نہ کسی طرح سے ہمارے لیے محرک ثابت ہوئی ہیں۔

اردو زبان کی باقاعدہ لسانی تاریخ نویسی کا آغاز محمود شیرانی کی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' ۱۹۲۸ء سے ہوتا ہے۔ ایک جانب مصنف کے سامنے اس موضوع پر علما اور مستشرقین کی متعدد تحریریں نمونے کے طور پر موجود تھیں تو دوسری جانب زبان کے مطالعے میں لسانیاتی رجحان اپنایا جانے لگا تھا۔ موصوف نے پنجابی زبان کے غائر مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جس زبان کو ہم 'اردو' کہتے ہیں سرزمین پنجاب میں پیدا ہوئی اور وہیں سے ہجرت کر کے دہلی پہنچی۔ اس تصنیف کی دو خصوصیات ہیں اول یہ کہ یہ ایک باقاعدہ لسانی تحقیق ہے اور دوئم یہ کہ اس میں اردو زبان کا ماخذ اور مولد دہلی اور نواح دہلی کی بجائے پنجاب اور پنجابی زبان کو بتایا گیا ہے۔ مصنف کے تحقیقی طریقۂ کار اور موضوع سے متعلق استدلال نے معاصرین میں انہیں منفرد مقام دلایا۔ اس کتاب میں پنجاب کے علاقے اور اس کی انفرادیت، پنجابی اور اردو، قدیم اردو پر پنجابی زبان کے اثرات، پنجاب کی مختلف زبانوں کے علاوہ پنجابی زبان کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے۔

''پنجاب میں اردو'' کے فوراً بعد سید محی الدین قادری زورؔ کی تحقیق کا خلاصہ منظر عام پر آیا۔ اس کتابچہ میں مصنف موصوف نے بھی پنجابی پر خاطر خواہ توجہ صرف کی ہے۔ لیکن اردو کے مولد کو پنجاب تا الہ آباد تک وسیع کر کے دیکھا ہے۔ نصف صدی تک آتے آتے پروفیسر مسعود خاں کے تحقیقی مقالہ کی روشنی میں اردو کی تاریخ کا منظر نامہ بدل جاتا ہے۔ انہوں نے ایک مفصل اور مربوط تاریخ کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کے آغاز و ابتدا کا سراغ دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں میں ہی تلاش کرنا چاہیے۔ شروع میں اردو کے ماخذ کے سلسلے میں انہوں نے مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں ہریانی پر زور دیا لیکن بعد میں اس نظریہ میں ترمیم کیا اور کھڑی بولی کو اردو کی اصل قرار دیا۔ اپنے اس خیال کی تشریح اور اشاعت موصوف نے اپنی کئی تحریروں مثلاً اردو زبان کی تاریخ تشکیل اور تقدیر، اردو زبان اور ادب کے ذریعے سے کی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ہی سیّد احتشام حسین نے ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' میں ایک مقدمہ کے ذریعہ سے اس خیال کی تائید کی گو کے یہ کتاب اردو زبان کی تاریخ نہیں مگر اس مقدمہ کا شمار اس نوعیت کی ایک اہم تحریر میں ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو زبان کی تاریخ اور ہندوستانی لسانیات پر لکھنے والوں کی خاصی تعداد ہے۔ لیکن ان میں کسی کا کوئی بڑا کارنامہ وجود میں نہیں آیا۔ ان میں بعض نے پرانی عمارت کو مزید بلند کرنے کا کام کیا اور مسلمہ حقائق کی تشریح اور توضیح میں سرگرم رہے تو بعض نے اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے بالکل الگ راستہ اختیار کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بھی ''اردو زبان کا ارتقا'' اور ''داستان زبان اردو'' لکھ کر وقیع کام کیا ہے۔ اول الذکر کتاب ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس میں اردو زبان کے ماخذ کے سلسلے میں ذرا سا بھٹکے اور پالی زبان کی دل کھول کر وکالت کی اور دوسری تصنیف میں اپنے تسامحات کو محسوس تو کیا لیکن اس کا اعتراف نہیں کر سکے۔ دوسری تصنیف ''داستان زبان اردو'' دراصل ہندوستانی ماہرین اور مستشرقین کی مستند کتابیں پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے مگر اس میں بھی اردو کے ماخذ کے سلسلے میں ابہام پیدا کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی موصوف نے اردو زبان سے متعلق مسائل پر کثرت سے لکھا ہے بعد میں انھیں مضامین پر مشتمل دو مجموعے ''لسانی مطالعے'' اور ''اردو لسانیات'' کے نام سے منظر عام پر آئے۔ ان کی تصانیف اور تحریریں اردو کی لسانی تاریخ میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔

گیان چندجین، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، سہیل بخاری، امیر اللہ شاہین، آمنہ خاتون، پروفیسر عبدالستار دلوی، ڈاکٹر خورشید حمرا صدیقی وغیرہ نے بطور خاص اردو زبان کی تاریخ پر توجہ صرف کی ہے۔ گوکہ ان تمام حضرات کا رویّہ اور انداز ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان ماہرین میں دو حضرات گیان چندجین اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے نام خاصے اہم ہیں۔ انہوں نے اردو کے مسائل اور اس کی تاریخ پر بطور خاص توجہ صرف کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گیان چندجین نے اپنی عمر کے آخری ایاّم میں ایک متنازعہ فیہ کتاب لکھ کر بیٹھے بٹھائے اپنے سر بدنامی لے لی۔ لیکن اس سے قبل کی تحریروں اور خدمات کے حوالے سے اردو زبان وادب کی تاریخ میں انہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مرزا خلیل احمد بیگ تقریباً چار دہائیوں سے اردو اور اس کی تاریخ پر خالص لسانی انداز سے متواتر لکھ رہے ہیں۔ اردو کی تاریخ پر ان کی کوئی باقاعدہ کتاب یا نظریہ نہیں ہے لیکن لسانیات کی رو سے مسلمہ حقائق کے توضیح اور تشریح میں وہ مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ چند ماہ قبل گیان چندجین کی تصنیف ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ دو ادب'' کی رد میں لکھے گئے ان کے مضامین پر مشتمل کتاب ''ایک بھاشا.. جو مسترد کردی گئی'' منظر عام پر آئی۔ اس میں مذکورہ کتاب کی تردید اور اعتراضات کے تحت مختلف موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے اگر ان کڑیوں کو ترتیب دیا جائے تو اردو زبان کی تاریخ سے متعلق ایک مکمل اور جامع کتاب تیاّر ہوسکتی ہے۔

باقی لوگوں کی کتابیں ان کے مخصوص نظریات پر مشتمل ہیں مثلاً سہیل بخاری اردو کو کبھی اڑیسہ لے جاتے ہیں تو کبھی مدھیہ دیش کی سنسکرت سے جوڑتے ہیں۔ آمنہ خاتون نے اردو سے متعلق دکن کا نظریہ پیش کیا تو خورشید حمرا صدیقی نے مدھیہ دیش کو اردو کا مولد قرار دیا ہے۔ اس کا تعین مصنفہ نے بڑے وسیع علاقے کے طور پر کیا ہے جس پر آخری باب میں بحث کی گئی۔

اردو کی لسانی تاریخوں کے مطالعے کے دوران مجموعی طور پر یہی احساس ہوتا ہے کہ تمام لسانی سروکار اور زبانوں کے تجزیے ایک جانب، لیکن تاریخ دراصل نام ہے واقعات اور مواد کی تعبیر نو کا۔ بس دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کسی مصنف یا محقق کے یہاں واقعات کی تعبیر اور تشریح میں معروضیت کس حد تک پیدا کی جاسکتی ہے اور یہی باتیں تاریخ نویسی کو استناد بخشتی ہیں۔

●●●

# کتابیات

# کتابیات


| نمبر شمار | نام مصنف/مرتب | فہرست کتب | ناشر، مقام | سنہ اشاعت |
|---|---|---|---|---|
| ۰۱۔ | آمنہ خاتون | دکنی کی ابتدا | بنگلور | ۱۹۷۰ء |
| ۰۲۔ | احمد دین بی۔اے | سرگذشت الفاظ | مطبوعہ لاہوری دروازہ لاہور | ۱۹۳۲ء |
| ۰۳۔ | احتشام حسین | ہندوستانی لسانیات کا خاکہ | دانش محل لکھنؤ، | ۱۹۴۸ء |
| ۰۴۔ | ............ | اردو ادب کی تنقیدی تاریخ | قومی کونسل | ۲۰۰۴ء |
| ۰۵۔ | امام بخش صہبائی | اردوے قدیم | مطبع منشی نول کشور لکھنؤ | ۱۹۶۷ء |
| ۰۶۔ | امام بخش صہبائی | رسالہ قواعد صرف ونحو اردو | مطبع نامی منشی نول کشور | ۰۰۰۰ |
| ۰۷۔ | امیر اللہ شاہین | جدید اردو لسانیات | | ۱۹۷۳ء |
| ۰۸۔ | ایم۔حبیب | مسعود حسین خاں: علمی، لسانی اور ادبی خدمات، خصوصی شمارہ، کتاب نما | | ۱۹۹۲ء |
| ۰۹۔ | انشاء اللہ خاں انشاء | دریائے لطافت | لکھنؤ | ۱۸۰۸ء |
| ۱۰۔ | پنڈت برج موہن دتاتریہ | ہماری زبان | ادارہ (اشاعت اردو، بھوپال | ۱۹۷۶ء |
| ۱۱۔ | ڈیوڈ کرسٹل | لسانیات کیا ہے | ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، | ۲۰۰۰ء |
| ۱۲۔ | جمیل جالبی | تاریخ ادب اردو | ای۔پی۔ایچ، دہلی | ۱۹۸۱ء |
| ۱۳۔ | چرن جی لال | اردو زبان کی تاریخ | | |
| ۱۴۔ | حامد حسن قادری | داستان تاریخ اردو | | ۱۹۴۱ء |
| ۱۵۔ | حمید الدین شرفی | ہند آریائی اور اردو | حیدرآباد، | ۱۹۸۶ء |
| ۱۶۔ | خورشید حمرا صدّیقی | اردو زبان کا آغاز۔مختلف نظریے اور حقائق | جموں یونیورسٹی، جموں | ۱۹۹۳ء |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۷۔ | خلیل صدیقی | زبان کیا ہے؟ | عاکف بک ڈپو | ۴۳۲۴ |
| ۱۸۔ | خلیل صدیقی | زبان کا ارتقا | قالات پبلیشرز | ۱۹۷۷ |
| ۱۹۔ | محمد ذاکر حسین | امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات | ........... | ۲۰۰۲ء |
| ۲۰۔ | رام بابو سکسینہ | تاریخ ادب اردو | ........... | ۱۹۲۸ء |
| ۲۱۔ | سرسیّد احمد خاں | آثار الصنادید | ........... | ....... |
| ۲۲۔ | سرسیّد احمد خاں | مقالات سرسیّد | ........... | ....... |
| ۲۳۔ | سیّدہ جعفر | تاریخ ادب اردو | قومی کونسل، نئی دہلی | ۲۰۰۱ء |
| ۲۴۔ | سیّدہ جعفر | ڈاکٹر زور | ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی | ۱۹۹۰ء |
| ۲۵۔ | سجاّد ظہیر | اردو، ہندی، ہندوستانی | کتب پبلیشر لمیٹڈ، بمبئی | ۱۹۴۷ء |
| ۲۶۔ | سلیمان ندوی | نقوش سلیمانی | اعظم گڈھ | ۱۹۳۹ء |
| ۲۷۔ | سنیتی کمار چٹرجی | ہندآریائی اور ہندی | قومی کونسل | ۲۰۰۰ء |
| ۲۸۔ | سہیل بخاری | اردو کا روپ | ........... | ........ |
| ۲۹۔ | سہیل بخاری | اردو کی کہانی | مکتبہ عالیہ، لاہور | ۱۹۷۵ء |
| ۳۰۔ | شمشاد زیدی | اردو زبان کا لسانی تجزیہ | سولن، ہماچل پردیس | ۱۹۷۹ء |
| ۳۱۔ | شمس الرحمٰن فاروقی | اردو کا ابتدائی زمانہ | کراچی | ۱۹۹۹ء |
| ۳۲۔ | شمس اللہ قادری | اردوئے قدیم | ........... | ۱۹۲۵ء |
| ۳۳۔ | شوکت سبزواری | اردو زبان کا ارتقاء | پاک کتاب گھر، ڈھاکہ | ۱۹۵۶ء |
| ۳۴۔ | شوکت سبزواری | داستان زبان اردو | چمن بک ڈپو، نئی دہلی | ۱۹۶۱ء |
| ۳۵۔ | شوکت سبزواری | اردو لسانیات | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ | ....... |
| ۳۶۔ | شوکت سبزواری | لسانی مسائل | پرویز بک ڈپو، دہلی | ....... |
| ۳۷۔ | ظفر ادیب | اردو زبان کا قومی کردار | دہلی | ۱۹۷۶ء |
| ۳۸۔ | عبدالقادر سروری | زبان اور علم زبان | انجمن ترقی اردو، حیدرآباد | ۱۹۵۶ء |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۳۹۔ | عبدالستار دلوی | اردو میں لسانی تحقیق | کوکل اینڈ کمپنی، بمبئی | ۱۹۷۱ء |
| ۴۰۔ | عتیق احمد صدیقی | ہند آریائی اور ہندی | قومی کونسل | ......... |
| ۴۱۔ | عبدالحق، مولوی | اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام | | ۱۹۳۹ء |
| ۴۲۔ | عبدالغفار شکیل | زبان و مسائل | ........... | ۱۹۷۴ء |
| ۴۳۔ | عبدالغفار شکیل | لسانی و تحقیقی مطالعے | ........... | ۱۹۷۵ء |
| ۴۴۔ | عبدالودود | اردو سے ہندی تک | نسیم بک ڈپو، لکھنؤ | ۱۹۷۶ء |
| ۴۵۔ | گراہم بیلی | اردو لٹریچر (اردو ادب کی تاریخ) | ........... | ۱۹۳۳ء |
| ۴۶۔ | گیان چند جین | ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب، | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، | ۲۰۰۵ |
| ۴۷۔ | گیان چند جین | لسانی مطالعے | ترقی اردو بیورو، نئی دہلی | ۱۹۹۱ء |
| ۴۸۔ | میر امن دہلوی | باغ و بہار | فورٹ ولیم کالج | ۱۸۰۲ء |
| ۴۹۔ | محمد اشفقصد یقی | انجمن ترقی اردو ہند | علی گڑھ | ۱۹۶۲ء |
| ۵۰۔ | محمد حسین آزاد | آب حیات | اتر پردیش اکیڈمی، لکھنؤ | ۱۸۷۸ء |
| ۵۱۔ | محمد حسین آزاد | سخندان فارس | مطبع مفید عالم، لاہور | ۱۹۰۷ء |
| ۵۲۔ | محمد مجیب | تاریخ تمدن ہند | پروگریسو بکس، لاہور | ۱۹۸۶ء |
| ۵۳۔ | مولوی یحییٰ تنہا | سیر المصنفین | غازیہ آباد | ۱۹۲۴ء |
| ۵۴۔ | محمود خاں شیرانی | پنجاب میں اردو | اتر پردیش، اکیڈمی لکھنؤ | ۱۹۲۸ء |
| ۵۵۔ | محی الدین قادری زور | ہندوستانی لسانیات، | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ | ۲۰۰۴ء |
| ۵۶۔ | مسعود حسن رضوی ادیب | اردو زبان اور اس کا رسم الخط | لکھنؤ | ....... |
| ۵۷۔ | مسعود حسین خاں | مقدمہ تاریخ زبان اردو، | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ | ۲۰۰۲ء |
| ۵۸۔ | مسعود حسین خاں | اردو زبان کی تاریخ تشکیل اور تقدیر، | شعبۂ لسانیات، مسلم یونیورسٹی | ۱۹۸۸ء |
| ۵۹۔ | مسعود حسین خاں | اردو زبان اور ادب | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ | ۱۹۷۶ء |
| ۶۰۔ | مسعود حسین خاں | اردو کا المیہ | شعبۂ لسانیات، مسلم یونیورسٹی | ۱۹۷۳ |

٦١۔ مسعود حسین — ورودِ مسعود: خودنوشت، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1988

٦٢۔ مرزا خلیل احمد بیگ — اردو کی لسانی تشکیل — علی گڑھ — ٢٠٠٠ء

٦٣۔ مرزا خلیل احمد بیگ — اردو زبان کی تاریخ — علی گڑھ — ٢٠٠٠ء

٦٤۔ نصیرالدین خاں خیال — داستان اردو — ........... — ١٩١٦ء

٦٥۔ نصیرالدین ہاشمی — دکن میں اردو — قومی کونسل، نئی دہلی — ١٩٢٤ء

٦٦۔ انسائکلو پیڈیا برٹینیکا جلد۔ ٧، — شکاگو یونیورسٹی — ........

٦٧۔ ورلڈ انساکلو پیڈیا — ورلڈ پبلیکیشن، یو۔ ایس۔ اے، ٢٠٠٥ء


## اخبار و رسائل


١۔ فکر و نظر — ڈپٹی نذیر احمد خصوصی شمارہ

٢۔ رسالہ قواعد صرف نحو — مولوی ڈپٹی نذیر احمد

٣۔ اخبار اردو، ماہنامہ، — مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

٤۔ آج کل — نئی دہلی، اگست ٢٠٠٨،

٥۔ قومی زبان — انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان

٦۔ نوائے ادب — انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

٧۔ صدائے اردو — بھوپال


●●●

# *Bibliography*

A. R. Lotto, *Historical Linguistics : An Introduction*

Bernard Bloch and George L.Trager : *Outline of Linguistic Analysis*, New Delhi, 1972

Bloom Field : *Language*, Botilal Banarsidas.1963

Bridget and Raymond Allchin : *The Rise of Civilization in India and Pakistan*, Cambridge University Press, London.1983

Chonmsky Noam : *Syntactic Structure*, New Delhi,1972

Christopher King : *One Language Two Scripts*, Oxford University Press, Bombay, 1994

D. P. Agrawal : Indus Civilization : *An Interdisciplinary Perspective*, Aryan Books, New Delhi, 2007

*Encyclopaedia Britanica*, Vol. VII. Chicago University.

G. A. Grierson : *Linguistic Survay of India* Vol. IX Part I 1968

Irfan Habib and Vijay Kumar Thakur : *A People History of India*,Vol III Aligarh Historian Society 2003.

Pushender Syal , D.V. Jindal : *An Introduction To Linguistics*, Prentice, New Delhi, 1998.

Robins, R.H. : *General Linguistics* : An Introductry Survay,Longman London ,1980

Romila Thapar : *A History of India,* Vol I Penguine Piblication 1990.

Sapir,Edward. *Language* : Harvest Book, New Delhi,1949

Sharma, Ram Sharan : *Advent of Aryans in India*, Manohar Publication New Delhi 1999.

Wardaugh Wardaugh. R : *An Introuduction To Linguistics,* New York 1972

Winfred. P. Lehman : *Historical Linguistics : An Introduction*, Oxford and IBH Publishing New Delhi 1976.

●●●